

استاد شهید مرتضی مطہری

عبدت و نماز

jabir.abbas@yahoo.com



عبدت و نماز

استاد شہید مرتضی مطہری

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

یک از مطبوعات

دارالنّھلین



پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳ - کراچی ۷۳۶۰۰ - پاکستان

فہرست

۵	عرض ناشر
۷	عبادت و نماز (۱)
۸	نماز کی اہمیت
۱۰	زادہ اور صوفی نمالوں
۱۳	دین کے بارے میں ایک غلط تصور
۱۹	علیٰ ایک جامع الصفات ہستی
۲۰	مرد مسلمان کی بعض نمایاں صفات
۲۵	معنویات کو خفیف نہ سمجھنے
۳۵	عبادت و نماز (۲)
۳۶	عبادت اور تربیت
۳۸	ایمان کی تاثیر
۴۳	عصمت اور ایمان
۴۶	اسلام دنیا اور آخرت کا جامع
۵۳	خدا کی کبریائی
۵۸	اہل خانہ کے حوالے سے ذمے داری

عرض ناشر

زیرِ نظر رسالہ عبادت اور نماز کے موضوع پر استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی دو تقاریر کا مجموعہ ہے۔ یہ تقاریر ۲۳ اور ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ کو حسینیہ ارشاد تہران میں کی گئیں۔ ان تقاریر میں شہید مطہری نے اسلام میں عبادات و معنویات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ہے، خداوند عالم پر ایمان اور عبادات مें تینی اشارات پر گفتگو کی ہے اور فقط انہی میں ڈوب کے رو جانے یا انہیں پسرو نظر انداز کر دینے کی لئی کرتے ہوئے اسلام کے ایک جامع اور دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اور فلاح کے طالب دینے کی وکالت کی ہے۔

تقریر اور تحریر اپنے خیالات دوڑوں تک پہنچانے کے دو ذرائع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا علیحدہ انداز اور مخصوص اثر ہوا کرتا ہے۔ تقریر اپنی حرکات و سکنات اور چشم و ابرو کی جنبش کے ذریعے بھی پیغام دیتا ہے، جبکہ تحریر اس سہولت سے محروم ہوتی ہے۔ لہذا کسی تقریر کو اسکی پوری تاثیر کے ساتھ قلم بند کرنا ممکن نہیں۔ زیرِ نظر تقاریر کا تبدیل کرتے ہوئے کوشش کی گئی ہے کہ انکا تقریری انداز بھی محفوظ رہے اور ان میں کی جانے والی گفتگو کو تحریر کی صورت میں پوری پوری پہنچ جائے۔ ہم اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے اس سے ایک قارئیں مطلع کریں گے۔

امید ہے ہماری دوسری مطبوعات کی طرح یہ منتظر کرتا پچھے بھی قارئیں سے سند قبولیت پائے گا۔



عبدالله و نماز

۱۱

jabir.abbas@yahoo.com

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ لَمْ يُؤْمِنُوا اذْكُرُ وَاللَّهُ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَيِّئُوْهُ بُكْرَةً
وَأَصْبِلًا (سورة الحزاء ۳۳- آیت ۳۲۳)

”ایمان والو! کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا کرو اور صبح و شام اسکی تبعیج کیا
کرو۔“

نماز کی اہمیت

ہم اپنے مذہبی مصائب میں بعض الیسی چیزیں بھی دیکھتے ہیں جو کچھ اذیان میں
عبادت کے موضوع پر سوالات پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً نماز کے بارے میں ہم سے کہا جاتا
ہے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے یا انہمہ اطہار (۱) کا فرمان ہے کہ :النَّوْمُ عَلَى الْمَدِينَ (نماز دین کا ستون ہے۔ وسائل الشیعہ - ج ۳ - ص ۲۳ - ح ۱۳)

یعنی اگر ہم دین کو ایک نصب شدہ خیمہ بھیں، جس میں اس کی چادر بھی ہے، طناب
بھی، حلقہ بھی، ز میں میں گڑی ہوئی بڑی بڑی کیلیں بھی اور ایک ستون بھی جس نے اس خیمے
کو کھڑا کیا ہوا ہے، تو نماز اس نصب شدہ خیمے کے ستون کی مانند ہے۔

(۱) کیونکہ یہ چیز پیغمبر کے کلمات میں بھی پائی جاتی ہے اور انہمہ اطہار علیہم السلام کے فرمودات میں بھی
موجود ہے

حدیث نبویؐ میں، جو خود رسول کریمؐ سے نقل ہوئی ہے، خاص طور پر اسی بات کی بالکل اسی طرح وضاحت کی گئی ہے، جس طرح ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے۔

نماز کے بارے میں روایت ہے: إِنْ قِيلَتْ قِيلَ مَاسُوِّيْهَا وَإِنْ رُدَّتْ رُدَّ مَاسُوِّهَا۔ مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کی قبولیت نماز کے قبول ہونے سے مشروط ہے۔ یعنی اگر انسان کوئی نیک عمل انجام دے لیکن نماز نہ پڑھئے یا نماز پڑھے تو سہی لیکن درست نہ پڑھئے ایسی نماز پڑھے جو بارگاہِ الٰہی میں قبول نہ کی جائے، مسترد کر دی جائے۔ تو ایسی صورت میں اسکے دوسرے تمام نیک اعمال بھی مسترد کر دیئے جائیں گے۔ انسان کے تمام نیک اعمال کی قبولیت اسکی نماز کی قبولیت سے وابستہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے: الْمَصْلُوْهُ قُرُبَانٌ كُلَّ تَقْوَىٰ (نماز ہر مقنی کے لئے وسیلہ تقرب ہے۔ نجح البلاغہ۔ کلمات قصارہ ۱۳۶۲)۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ شیطان اس وقت تک مومن سے دور اور اس حنارا ض رہتا ہے جب تک وہ اپنی نماز کی حفاظت اور پابندی کرتا ہے۔

احادیث و روایات میں کثرت کے ساتھ اس طرح کی باتیں ملتی ہیں، حتیٰ خود آیات قرآنی سے اس مفہوم یعنی نماز کی غیر معمولی اہمیت کو اخذ کیا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں اٹھنے والا ایک سوال جو گاہ بگاہ کچھ لوگوں کی زبان پر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ نماز کی اہمیت کے بارے میں اس قدر زیادہ احادیث میں سے کچھ احادیث تو ضرور جعلی ہوں گی، درست نہ ہوں گی، صحیح اور معتبر نہ ہوں گی، پیغمبرؐ یا ائمۃ اطہارؐ کا کلام نہ ہوں گی؟ ان احادیث کو شاید اس دور میں وضع کیا گیا ہوگا جس میں عالم اسلام میں زاہد اور عبادت گزار افراد کی کثرت ہو گئی تھی، یہ اس دور کی ساختہ ہوں گی جب (اسلامی دنیا) میں زہد و عبادت کا بازار گرم تھا، بالخصوص دوسری اور تیسرا صدی ہجری میں جبکہ زاہد مسک اور عبادت میں حد سے گزر جانے والے افراد ظاہر ہوئے تھے، جو کم و بیش رہا تیت اختیار کر

چکے تھے۔

زادہ اور صوفی نما لوگ

ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت سے دنیا نے اسلام میں تصوف نے جنم لیا، اسی دور سے ایسے افراد پیدا ہو گئے تھے جو دیگر اسلامی فرائض و اجابت کو بھلا کر اپنی ساری طاقتیں صرف عبادت اور نماز میں صرف کرتے تھے۔

مثلاً ہم حضرت علیؑ کے اصحاب میں ربع بن خشم نامی ایک شخص کو پاتے ہیں، یہ وہی معروف خواجہ ربع ہیں جن سے منسوب ایک قبر مشہد مقدس میں ہے۔ اب میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ قبر انہی کی ہے یا نہیں، مجھے اس بارے میں خاطر خواہ معلومات نہیں۔ البتہ اس بارے میں شک نہیں کیا، زہادِ ثہماںیہ، یعنی دنیا نے اسلام کے آٹھ معروف زادوں میں سے ایک شمار کئے جاتے ہیں۔

ربيع بن خشم کے زہد و عبادت کا یہ عالم تھا کہ اپنی عمر کے آخری دور میں (۱) انہوں نے اپنی قبر کھو دی اور وہ قتا فوت تجاکے اس قبر میں لیٹ جایا کرتے اور اپنے آپ کو وعظ و نصیحت کرتے۔ قبر میں لیٹ کر اپنے آپ سے کہتے کہ: یہ نہ بھلا یعنہا کہ آخر کار تمہیں یہیں آنا ہے۔

جب انہیں اطلاع ملی کہ لوگوں نے فرزند رسول حسین ابن علیؑ کو شہید کر دیا ہے تو انہوں نے اس اندوہنا کپ واقع پر اظہارِ افسوس کے طور پر صرف اتنا کہا کہ: ”وائے ہو

۱۔ ربع، حضرت علیؑ کے بعد امام حسینؑ کی شہادت کے زمانے تک حیات رہئے یہ تقریباً ۲۰ سال پر محیط عرصہ ہے۔ یعنی جس زمانے میں امام حسینؑ کو شہید کیا گیا، یہ زندہ تھے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ پورے ۲۰ سال ان کا کام فقط اور فقط عبادت تھا اور اس عرصے میں انہوں نے کوئی دنیاوی بات زبان سے ادا نہ کی۔

اس امت پر جس نے اپنے پیغمبر کے فرزند کو شہید کیا، اور یہ (اس بیس سال کے عرصے میں) ذکر الہی اور دعا و مناجات کے سوا ان کی زبان سے ادا ہونے والا واحد جملہ تھا۔ کہتے ہیں کہ بعد میں انہوں نے استغفار کیا اور پیشان ہوئے کہ آخر کیوں میں یہ چند کلمات زبان پر لایا جو ذکرِ خدا نہ تھے۔

یہی ربیع بن خشم، امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے دو خلافت میں، حضرتؑ کی سپاہ میں شامل تھے۔ ایک روز امیر المؤمنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا امیر المؤمنینؑ آنا شکھنا ہی ہذا القتال (۱)۔ اے امیر المؤمنین! ہمیں اس جنگ کے بارے میں شک ہے۔ ہمیں خدا ہے کہ کہیں یہ جنگ غیر شرعی نہ ہو۔ (کیوں؟ کس وجہ سے؟) اس لئے کہ ہم اہل قبلہ (مسلمانوں) کے خلاف بر سر پیکار ہیں، ہم ایسے لوگوں کے خلاف تلواریں اٹھائے ہوئے ہیں جو ہماری ہی مانند شہادتیں (کلمہ) پڑھتے ہیں، ہماری ہی طرح نماز ادا کرتے ہیں، ہماری ہی مثل رو ب قبلہ کھڑے ہوتے ہیں۔

ربیع، امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے شیعہ تھے اس لئے ان سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتے تھے، لہذا کہتے ہیں: اے امیر المؤمنین! براۓ کرم میرے پر دکوئی ایسا کام کیجئے جو شک و شبہ سے پاک ہو۔ مجھے کسی ایسی جگہ، کسی ایسی ڈیوٹی پر بھیج دیجئے جس میں شک نہ ہو۔

امیر المؤمنینؑ نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا: بہت اچھا، اگر تم شک میں مبتلا ہو تو میں تمہیں ایک دوسرا جگہ بھیج دیتا ہوں۔

معلوم نہیں خود انہوں نے اس جگہ جانے کی درخواست کی یا خود امیر المؤمنینؑ نے فیصلہ کر کے انہیں مملکتِ اسلامی کی سرحدوں میں سے ایک سرحد پر بھیج دیا، وہاں بھی وہ

۱- ان کے ”انا“، کہنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ کئی لوگوں کے نمائندے کی حیثیت سے آئے تھے۔

سپاہی کی حیثیت سے تعینات تھے، لیکن یہ ایک ایسی سرحد تھی کہ اگر اتفاق سے وہاں جنگ اور خونزیزی کی نوبت آتی بھی تو دوسری طرف کفار یا بات پرست ہوتے، غیر مسلم ہوتے۔ جی ہاں، یہ تھا اس زمانے کے زہاد اور عبادت گزار افراد کا ایک نمونہ۔

ایسا زہاد و عبادت کس کا مکام کا؟
کسی کام کا نہیں۔

ایک ایسا شخص جو حضرت علیؑ جیسی شخصیت کے لشکر میں شامل ہو۔ لیکن علیؑ کی دکھائی ہوئی راہ، اور علیؑ کے فرمان جہاد کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہوئی یہ خیال اسکے ذہن میں آئے کہ آپؐ کا یہ فرمان، یہ حکم دست بھی ہے یا نہیں؟ اس موقع پر وہ احتیاط پر عمل کرنے، احتیاط پر بنار کھے۔ اسی طرح جیسے آج کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیوں مشکوک روزہ رکھیں؟ آپؐ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان یہ بات بہت عام ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم کیوں ایسا روزہ رکھیں جس میں شک ہے، یہ جو کوئی عمل ہوا؟ کیوں ایسی جگہ جنگ کریں جہاں شک ہو؟ ہمیں ایسی جگہ چلنا چاہئے جہاں رکھے جائے والے روزے میں شک نہ ہو اس بات کی کیا اہمیت ہے؟

اسلام بصیرت کا تقاضا کرتا ہے۔ عمل بھی طلب کرتا ہے بصیرت بھی۔ یہ شخص (خواجہ ربیع) بصیرت کے حامل نہ تھے۔ انہوں نے معاویہ اور یزید جیسے ظالم کے دور میں زندگی بسر کی۔ دورِ معاویہ جس میں دین خدا میں تبدیلیاں کی گئیں، اس میں بدعتیں ایجاد کی گئیں۔ یزید جو تاریخ اسلام کے بھیانک ترین جرائم کا مرتب ہوا، اور پیغمبر اسلامؐ کی تمام تر کوششوں اور محنتوں پر پانی پھیر دینے کے درپے ہوا۔ لیکن ایسے دور میں یہ صاحب (خواجہ ربیع) گوشہ نشینی اختیار کر کے شب و روز مسلسل نماز میں مشغول رہتے ہیں، ذکرِ الہی کے سوا کوئی کلمہ ان کی زبان سے ادا نہیں ہوتا اور اگر حسین ابن علیؑ کی شہادت پر اظہار تاسف کے لئے ایک جملہ ان کی زبان سے نکل بھی جاتا ہے تو بعد میں اپنے اس عمل پر پشیمان ہوتے

بیں کہتے ہیں کہ یہ تو دنیوی بات ہو گئی، میں نے اس کی بجائے سبحان اللہ، الحمد للہ، کیوں نہ کہا؟ اسکی جگہ یا حی یا قیوم کیوں نہ کہا؟ اللہ اکبر اور لا حول ولا قوہ الا باللہ کیوں نہ پڑھا؟

یہ طرزِ عمل اسلامی تعلیمات سے موافق نہیں۔ لا يُرَى الْجَاهِلُ الْأَمْفُرْ طَأَوْ مُفَرَّطًا (جاہل کونہ پاؤ گے مگر یاحد سے بڑھا ہوا اور یا اس سے بہت پیچھے۔ نجح البلاغہ۔ کلمات قصار ۲۶)۔ جاہل یا تو بہت آگے بڑھ جاتا ہے یا بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

دین کے بارے میں ایک غلط تصور

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ: **الصَّلَاةُ عَمُودُ الدِّينِ** (نماز دین کا ستون ہے) والی بات کسی بھی طرح اسلامی تعلیمات سے موافق نہیں۔ کیونکہ دین اسلام تو سب چیزوں سے زیادہ اجتماعی مسائل کو اہمیت دیتا ہے۔ اسلام تو انَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعُدْلِ وَالْحُسَانِ (۱) کا دین ہے۔ اسلام تو لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا بِالْبُيُّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُولُوا إِنَّمَا مَا أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ بِالْقُسْطِ (۲) کا دین ہے۔ اسلام تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دین ہے: كُنْتُمْ خَيْرًا مِّنْ أُخْرِ جَمِيعِ الْمُجْرِمِينَ تَاهُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهُوُنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳) اسلام جہدِ مسلسل اور کوشش اور عمل کا دین ہے۔ اسلام ایک عظیم دین ہے۔

- ۱- بے شک اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔ سورہ نحل ۱۶-۹۰ آیت۔
- ۲- بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ سورہ حمید ۷-۲۵ آیت۔
- ۳- تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔ سورہ آل عمران ۳-۱۱۰ آیت۔

ایک ایسا دین جو مذکورہ مسائل کو اتنی اہمیت دیتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ عبادت کے لئے اتنی زیادہ اہمیت کا قائل ہو؟ نہیں، دین اسلام میں عبادت کے مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ ہمیں اسلام کی اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات کے نفاذ کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ عبادت بے کار لوگوں کا مشغله ہے۔ جنہیں کوئی اہم ترین کام نہ ہو وہ نماز پڑھیں، وہ عبادت کریں۔ لیکن ایک ایسا شخص جس کے سامنے اہم ترین کام ہوں اسکے لئے لازم نہیں کہ وہ عبادت بجا لائے۔

یہ بھی ایک غلط فکر ہے اور انتہائی خطرناک۔ اسلام کو اس طرح سمجھنا چاہئے، جیسا کہ وہ ہے۔

میرے ان عرائض کی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو میں اپنے معاشرے میں ایک بیماری کی صورت میں محسوس کر رہا ہوں۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں جو لوگ اسلام کا نعرہ بلند کر رہے ہیں ان میں سے اکثر (البتہ سب کو نہیں کہتا) دو گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک گروہ رجیب بن خشیم جیسے طرز فکر کا حامل ہے، خواجہ ربع کی طرح سوچتا ہے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک ”اسلام“ ذکر و دعا کرنے، نوافل پڑھ لینے، زیارات پر جانے اور زیارت عاشورہ کی قرآنیت کا نام ہے۔ ایسے افراد کے نزدیک اسلام کے معنی مفاتح اور زاد المعاو ہے (دعاؤں کی دو معروف کتابیں)۔ ان کا پورا کا پورا اسلام مفاتح الجنان میں سمٹ آیا ہے۔ اسکے سوا ان کے نزدیک کسی اور چیز کا وجود ہی نہیں، یہ لوگ بالکل رجیب بن خشیم کی سوچ رکھتے ہیں۔ انہیں دنیا سے کوئی سروکاری نہیں، مسئلے حیات سے کوئی غرض بھی نہیں، اسلام کی اجتماعی تعلیمات سے کوئی مطلب نہیں، اسلامی اصول و اركان سے کوئی لگاؤ نہیں، اسلامی تربیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ انہیں سرے سے کسی بھی چیز سے مطلب نہیں۔

ان لوگوں کی تغیریط کے ردِ عمل میں ایک افراطی طبقہ پیدا ہوا ہے۔ یہ طبقہ اسلام کے

اجتمائی مسائل کو اہمیت دیتا ہے، ان کے بارے میں حساسیت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس پہلو سے یہ لوگ قابل قدر ہیں۔ لیکن انہی لوگوں میں سے کچھ کو بعض اوقات میں دیکھتا ہوں کہ مثلاً مستطیع ہونے کے باوجود حج کو نہیں جاتے۔ یہ شخص جو واقعًا مسلمانوں سے، حقیقتاً اسلام سے لگا و رکھتا ہے، اسکا دل اسلام کے لئے دھڑکتا ہے، لیکن مستطیع ہوتے ہوئے بھی حج کو نہیں جاتا، اس کی نظر میں حج کی کوئی اہمیت بھی نہیں، تقلید ضروری ہے لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا۔ حالانکہ تقلید ایک معقول بات ہے۔

تقلید کے کہتے ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ یا تو آپ، نماز روزہ جیسی چیزوں کے مسائل کو (مصادر شرع سے) براہ راست خود اخذ کیجئے۔ یعنی اس میدان میں اس قدر ماہر ہو جائیے کہ اس مہارت کے بل بوتے پر خود اتنباط کر سکیں۔ یا پھر یہ کہ احتیاط پر عمل کیجئے، جو ایک خاص ادشوار کام ہے۔ یا پھر ایک ماہر جامع الشرائط عادل شخص کا انتخاب کیجئے اور جس طرح ایک ماہر طبیب سے رجوع کر کے اسکے بتائے ہوئے پر عمل کرتے ہیں اس طرح اس کی رائے پر عمل کیجئے۔ انسان بغیر تقلید کے رہ بھی نہیں سکتا۔ یعنی اگر وہ تقلید نہ کرے تو اپنے آپ کو بہت زیادہ مشکل میں ڈال لیتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ روزے کو اہمیت نہیں دیتے۔ اگر کسی سفر کی وجہ سے ان کا روزہ قضا ہو جائے تو اس قضا کو ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو ایک کامل مسلمان سمجھتے ہیں۔ وہ اول الذکر گروہ بھی خود کو کامل مسلمان سمجھتا ہے، جبکہ نہ یہ کامل مسلمان ہیں نہ وہ۔ دین اسلام نُؤْمِنْ بِيَغْضِيْ وَ نَكْفُرُ بِيَغْضِيْ (۱) سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اسلامی عبادات کو تو اپنائے لیکن اسکے معاشرتی اور اخلاقی قوانین کو نہ لے۔

۱۔ ہم بعض چیزوں پر ایمان لائیں گے اور بعض چیزوں کا انکار کریں گے۔ سورہ نسا ۳- آیت ۱۵۰۔

اسکے امر بالمعروف اور نبی عن الممنکر کو اختیار نہ کرے۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انسان امر بالمعروف اور نبی عن الممنکر کو لے لے، اور اسلامی عبادات کو چھوڑ دے۔

قرآن مجید جہاں کہیں بھی اقیسوں الصلاۃ کہتا ہے، اسکے فوراً بعد آتی الزکاۃ کہتا ہے۔ اگر اقام الصلاۃ کہتا ہے تو اسکے بعد آتی الزکاۃ کہتا ہے۔ جب یقیموں الصلاۃ کہتا ہے تو اسکے بعد یوں الزکاۃ کہتا ہے۔ یقیموں الصلاۃ کا تعلق بندے اور خدا کے درمیان رشتہ سے اور یوں الزکاۃ کا رابطہ بندگان خدا کے آپ کے تعلقات سے ہے۔

جس طرح ایک مرد مسلمان کو اپنے اور اپنے رب کے درمیان ایک مستقل اور مسلسل رابطے کی ضرورت ہے اسی طرح اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے معاشرے کے درمیان بھی ایک مستقل اور مسلسل رابطہ قائم رکھے۔

بغیر عبادت کے، بغیر ذکر الہی کے، بغیر یادِ خدا کے، بغیر مناجات کے، بغیر حضور قلب کے، بغیر نماز کے، بغیر روزے کے ایک اسلامی معاشرہ تکمیل نہیں پاسکتا، حتیٰ خود انسان بھی سالم نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح بغیر ایک سالم معاشرے کے، بغیر ایک سالم ماحول کے، بغیر امر بالمعروف کے، بغیر نبی عن الممنکر کے، بغیر مسلمانوں سے پیار و محبت کے اور بغیر دوسروں کی مدد اور ان کے ساتھ تعاون کے انسان ایک اچھا عبادت گزار بندہ نہیں بن سکتا۔

علیٰ ایک جامع الصفات ہستی

آپ اگر حضرت علی ابن ابی طالب کی حیات پر ایک سرسری سی نگاہ بھی ڈالیں تو پتا چل جاتا ہے کہ آپ ایک عابد بلکہ دنیا کے اوپرین درجے کے عابد ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی عبادت تمام عالم میں ضرب المثل بن جاتی ہے۔ عبادت بھی ایسی کہ فقط خم و راست ہونا

نہیں، (بے روح رکوع و وجود نہیں) بلکہ ایسی عبادت جو اول سے آخر تک جذبات سے، والوں سے، عشق سے، گریہ و زاری سے لبریز ہے۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد ”ضرار“ نامی ایک شخص کی معاویہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاویہ کو معلوم تھا کہ ”ضرار“، حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے ہیں۔ چنانچہ فرمائش کی: تم علیؑ کے ساتھ ہوا کرتے تھے، میرے سامنے ان کے فضائل بیان کرو۔ خود معاویہ اچھی طرح حضرت علیؑ سے واقف تھے۔ لیکن اسکے باوجود وہ دوسروں سے ان کے بارے میں سننا پسند کرتے تھے کونکہ وہ دل کی گہرائیوں سے حضرت علیؑ کی عظمت کے قائل تھے، حالانکہ یہی تھے جنہیوں نے حضرت علیؑ کے خلاف تلوار تک اٹھائی تھی۔

انسان ایسا ہی موجود ہے! وہ عقیدت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہیوں نے حضرت علیؑ کے خلاف ناپسندیدہ اقدامات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

”ضرار“ نے معاویہ کے سامنے اپنا ایک مشاہدہ اُنقل سیا۔ کہا: میں نے ایک رات علیؑ کو محراب عبادت میں دیکھا: یَتَمَلَّمَ تَمَلَّمَ السَّلِيمَ وَيَنْكِي بَكَاءَ الْحَزِينَ۔ یعنی آپ محراب عبادت میں خوف خدا سے ایک ایسے شخص کی مانند بڑی پر رہے تھے جسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ایک انسان کی مانند گریہ و زاری میں مشغول تھے، سرد آہیں بھرتے تھے، آتش جہنم سے لرزائ آہ آہ کرتے تھے۔ مولائے کائنات کی یہ کیفیت سن کر معاویہ کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔

اسی طرح جب حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ایک موقع پر معاویہ اور عدی بن حاتم کی ملاقات ہوئی تو معاویہ نے عدی بن حاتم کو حضرت علیؑ کے خلاف بھڑکانا چاہا۔ عدی سے کہا: این الطوفات؟ طریف، طرفہ اور طارف کیا ہوئے؟

۱- حضرت عدی بن حاتم کے تین فرزند تھے، جن کے نام طریف، طرفہ اور (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

حضرت عدی بن حاتم نے جواب دیا: وہ سب صفين میں علی کی رکاب میں شہید ہو گئے۔

معاویہ نے کہا: علی نے تیرے ساتھ نا انصافی کی، اپنے بچوں حسن حسین کو تو پیچھے رکھا اور تیرے بچوں کو آگے کر کے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

حضرت عدی بن حاتم نے جواب دیا: حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے علی کے ساتھ نا انصافی کی۔ اگر میں انصاف کرتا تو آج میں زندہ اور علی زیر خاک نہ ہوتے۔

معاویہ نے جب اپنا نشانہ خطا جاتے دیکھا تو عدی سے کہا: اے عدی! میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھے علی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ عدی بن حاتم نے تفصیل کے ساتھ حضرت علی کے اوصاف بیان کئے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر میں، میں نے دیکھا کہ معاویہ زار و قطار رورہے ہیں۔ اسکے بعد انہوں نے آسمین سے اپنے اوصاف کئے اور کہا: افسوس کہ زمان علی کی مانند انسان جننے سے بانجھ ہے۔

دیکھئے حقیقت کیے جلوہ گر ہوتی ہے؟

یہ تو تھی حضرت علی کی عبادت، لیکن کیا علی صرف ابل محراب تھے، محراب کے سوا کہیں اور نظر نہ آتے تھے؟

بم حضرت علی کی زندگی کے ایک اور رخ کا جائزہ لیتے ہیں (اوڑوہ آپ کی حیات اجتماعی سے تعلق رکھتا ہے) آپ ہر لحاظ سے ایک اجتماعی ترین فرد تھے، ضرورت مندوں، بے کسوں، مسکینوں اور لاچاروں کے حالات سے واقف ترین فرد تھے۔ خلیفہ ہونے کے

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) طارف تھے۔ ان کے ان تینوں فرزندوں نے حضرت علی کی رکاب میں جنگ کرتے ہوئے جام شہادت اوش کیا تھا۔ معاویہ عدی بن حاتم کے جذبات بھر کا ناچابت تھے۔ لہذا ان کے زخمیوں پر نمک پاشی کی تاکہ ان کے منہ سے حضرت علی کے خلاف ایک لفظ ہی نکلا اسکیں۔

باوجود آپ دن کے وقت اپنا درہ یعنی کوڑا کا نہ ہے پر لٹکائے، بنفس نفس لوگوں کے درمیان گشت فرماتے تھے۔ ان کے معاملات کا جائزہ لیتے تھے۔ جب تاجر و کے پاس پہنچتے تو فرماتے: **الْفَقْهَ ثُمَّ الْمَتَجَر** (۱)۔ جاؤ پہلے تجارت کے مسائل سیکھو، اسکے شرعی احکام کی تعلیم حاصل کرو، اسکے بعد آپ کے تجارت کرنا۔ حرام خرید و فروخت نہ کرو، سودی معاملہ نہ کرو۔

اگر کسی کوتائی سے اپنے کام پر جاتے دیکھتے تو فرماتے۔ **أَغْدُوا إِلَيْيَ عَزَّكُمْ**۔ ایک انتہائی عبادت گزار فرد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ میں یہ خصوصیت بھی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے مذکورہ حدیث مرحوم آیت اللہ العظمیٰ بروجردیٰ کی زبانی سنی تھی۔ ایک مرتبہ ایک گداگر، آقائے بروجردیٰ کے بیہاں آ کے ان کے سر ہو گیا، اور کچھ طلب کرنے لگا۔ انہوں نے اس پر نگاہ ڈالی، دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ شخص محنت مزدوری کر سکتا ہے لیکن گداگری کو اس نے اپنا پیشہ بنالیا ہے۔ لہذا انہوں نے اسے نصیحت کی اور بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ حضرت علیؑ کا یہ جملہ بھی فرمایا: کہاں کہ امیر المؤمنین لوگوں سے فرماتے تھے: **أَغْدُوا إِلَيْيَ عَزَّكُمْ** (۲) علیؑ اصلاح اپنی عزت و شرف کی طرف روانہ ہوا کرو۔ یعنی اپنے کام، محنت مزدوری اور حصول روزگار کی طرف جایا کرو۔ انسان اس وقت عزیز و سر بلند ہے جب وہ خود کماتا ہو، اپنی معاش کا بندوبست خود کرتا ہو۔ محنت مزدوری عزت ہے، شرافت ہے۔

اسے کہتے ہیں حقیقی مثالی مسلمان۔

آپ عبادت کے میدان میں سرفہرست عبادت گزار ہیں۔ جب قضاوت کی مند پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو ایک عادل قاضی ہیں، ذرہ برابر بے انصافی نہیں کرتے۔ جب

میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں تو ایک بہادر سپاہی اور شجاع سپاہ سالار ہیں، ایک اول درجے کے کمانڈر ہیں، خود فرماتے ہیں: میں نے ابتدائے شباب ہی سے جنگ کی ہے، جنگ کا تجربہ رکھتا ہوں۔ اور جب آپ خطابت کی کرسی پر تشریف فرماتے ہیں تو اول درجے کے خطیب ہیں۔ جب مدرسیں کی ذمے داری سنبھالتے ہیں تو اول درجے کے معلم و مدرس ہیں۔

ہر ایک فضیلت میں آپ کا یہی حال ہے۔ یہ ہیں اسلام کا نمونہ کامل۔

اسلام کسی صورت نوْمِنْ بِعَضٍ وَ نَكْفُرُ بِعَضٍ کو قبول نہیں کرتا۔ لہذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اسلام کے اک ایک پہلو کو تو مانیں گے لیکن اس کے اس دوسرے پہلو کا انکار کریں گے۔ دنیا نے اسلام میں پیدا ہونے والے انحراف کا نقطہ آغاز یہی ہے۔ اگر ہم اسلام کے کسی ایک پہلو کو لیں لیکن اسکے دوسرے پہلووں کو چھوڑ دیں تو اس طرح ہر چیز میں خرابی اور بگاڑ پیدا کر بیٹھیں گے۔

جس طرح گزشتہ ادوار میں ہمارے بہت سے زندہ یتھہ افراد کی روشن غلط تھی، ایسے لوگوں کی روشن غلط تھی جو پورے اسلام کو مثلاً مفاتیح الجہان میں منحصر سمجھتے ہیں، (دعاؤں کی ایک کتاب) بیاض میں محدود کر دیتے ہیں، اسی طرح ایسے لوگوں کی روشن بھی غلط ہے جو دعا، عبادت، نوافل اور فرائض کو یکسر چھوڑ بیٹھتے ہیں اور اسلام کے صرف اجتماعی مسائل کے بارے میں توجہ چاہتے ہیں۔

مردم مسلمان کی بعض نمایاں صفات

سورہ مبارکہ ”انا فتحنا“ میں ارشاد الہی ہے: **مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ** آئیشَدَ آئُهُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءَ بَيْنَهُمْ (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے سخت ترین اور آپس میں انتہائی مہربان ہیں۔ سورہ فتح ۳۸۔

(۲۹ آیت)

اس آیت میں ایک اسلامی معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سب سے پہلے جس مسئلے کا ذکر کیا گیا ہے وہ پیغمبر کی معیت اور ان پر ایمان ہے، اسکے بعد اشداء علی الکفار یعنی بے گانوں کے مقابلے میں سخت ترین، قوی اور طاقتور ہونے کا ذکر ہے۔

پس وہ خشک مقدس نما لوگ جو مسجد میں ڈیرہ جمائے رہتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود صرف ایک سپاہی کی لکار پر دم سادھ لیتے ہیں اور چوں بھی نہیں کرتے، وہ مسلمان نہیں۔

قرآن کریم نے مسلمان کی ایک خصوصیت، بلکہ اولین خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ دشمن کے بال مقابل سخت، پاسیدار اور ثابت قدم ہوتا ہے۔ اسلام ست اور کمزور مسلمان کو پسند نہیں کرتا: **وَلَا تَهْنُوا وَلَا تَحْزِنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ** (خبردار سنتی نہ کرنا مصائب پر محروم نہ ہونا، اگر تم صاحب ایمان ہو تو سر بلندی تمہارے ہی لئے ہے۔ سورہ آل عمران ۳-۳۹ آیت ۱۳۹)۔

اسلام میں سستی اور کمزوری کی کوئی گنجائش نہیں۔ ویل ڈیورٹ کتاب 'تاریخ تمدن'، میں کہتا ہے: اسلام کی مانند، کسی اور دین نے اپنے ماننے والوں کو قوت و طاقت کے حصول کی دعوت نہیں دی۔

گردن ڈالے رکھنا، گوشہ کلب سے رال پکنا، گریبان (collar) کا ایک طرف ڈھلکا ہونا، اسکا گندہ ہونا، خود کو غریب والا چار طاہر کرنا، زمین پر پیغمبیر گھیٹ کر چلنا، عبا سر پر ڈال لینا، یہ سب چیزیں اسلامی تعلیمات کے برعکس ہیں۔ یوں ہی بلا وجہ آہیں بھرنا اسلام کے خلاف ہے۔

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدَّثَ (او را پنے پروردگار کی نعمتوں کو مسلسل بیان کرتے رہنا۔ سورہ ضحیٰ ۹۳-آیت ۱۱)

خدا نے آپ کو صحت دی ہے، جسمانی سلامتی دی ہے، قوت عطا کی ہے، طاقت و توانائی سے نوازا ہے۔ آپ اپنی کمر سیدھی رکھ سکتے ہیں تو کیوں بلا وجہ اسے جھکاتے ہیں؟ آپ اپنی گردن سیدھی رکھ سکتے ہیں، کیوں بغیر کسی وجہ کے اسے ایک جانب لٹکائے رکھتے ہیں؟ کیوں بے وجہ آہ و نالہ بلند کرتے ہیں؟ آہ و نالہ تو انسان تکلیف کی حالت میں بلند کرتا ہے۔ خدا نے آپ کو کسی درد اور تکلیف میں بٹلانہ نہیں کیا ہے، تو پھر کیوں آپ آہ ہیں بھرتے ہیں؟ یہ تو نعماتِ الہی کا کفران ہے۔ کیا علیٰ بھی اسی طرح راستہ چلتے تھے جیسے ہم اور آپ چلتے ہیں؟ کیا علیٰ اسی طرح عباس پر ڈالتے تھے اور اسی طرح میڑ ہے میڑ ہے چلتے ہوئے راستہ طے کرتے تھے؟ (۱)۔ ان چیزوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

ashdāءِ علیٰ الکفار یعنی گاؤں کے مقابل سخت ترین، پکے اور مضبوط، جیسے سید سکندری۔

(ایک مرد مسلم کو) حلقہ یاراں میں، مسلمانوں کے ساتھ، کس طرح ہونا چاہئے؟ رحماء بینہم یعنی آپس میں مہربان، گھرے دوست (ایک دوسرے کے ساتھ ریشم کی طرح نرم ہونا چاہئے)۔

(اسکے برخلاف) جب ہم اپنے بعض مقدس نما لوگوں سے ملتے ہیں، ان کے یہاں جاتے ہیں تو جو چیز ہمیں ان میں نظر نہیں آتی وہ یہی اخلاص اور مہربانی ہے۔ ہمیشہ ان کی تیوریوں پر بل پڑے رہتے ہیں، بد اخلاق اور ترش رو ہیں۔ کسی کے ساتھ گرم جوشی سے پیش نہیں آتے، کسی سے بنس کے نہیں ملتے، دنیا کے ہر انسان پر احسان رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ مسلمان نہیں، یہ لوگ خود کو اسلام سے وابستہ ظاہر کرتے ہیں۔
یہ تھی (ایک مسلمان میں پائی جانے والی) دوسری خصوصیت۔

۱۔ شہید مطہری نے ان سطور میں اپنے دور کے بعض علمان افراود کی تصوری کشی کی ہے (مترجم)

کیا یہی کافی ہے؟

کیا مسلمان ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ انسان کفار کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اہل اسلام سے مہربانی اور پیار و محبت کا برتاؤ کرے؟ ۔۔۔ جب نہیں: **تَرَهُمْ رُكُعاً سُجَّداً يَتَغَوَّنُ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا** (تم انہیں دیکھو گے کہ بارگاہ واحدیت میں سر جھکائے ہوئے سجدہ ریز ہیں اور اپنے پروردگار سے فضل و کرم اور اسکی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔ سورہ فتح ۲۸-آیت ۲۹)

وہ شخص جو بے گا نوں کیلئے سخت دل اور اپنوں کے لئے مشق و مہربان ہے، اسی فرد کو جب محراب عبادت میں دیکھو گے تو رکوع و وجود دعا و عبادت اور مناجات میں مشغول پاؤ گے۔ رکعاً و سجداؤ اسکی عبادت ہے۔ یتیغون فضلا من الله و رضوانا اسکی دعا ہے۔

البِتَّةُ هُمْ دُعَا اور عبادت کے درمیان حد بندی کے قائل نہیں ہیں۔ دعا عبادت ہے اور عبادت بھی دعا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل فقط اور فقط خالص دعا ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایسی عبادت ہوتی ہے جو صرف دعا پر مشتمل ہے۔ لیکن کچھ عبادات ایسی ہیں جن میں دعا اور دعا کے علاوہ دوسری چیزیں بھی پائی جاتی ہیں، جیسے نماز۔ اسی طرح اور عبادات ہیں جو بنیادی طور پر دعا نہیں، جیسے روزہ۔

سِيَّمَا هُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ آثُرِ السُّجُودِ (سجدوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے چہروں پر نشان پائے جاتے ہیں)۔ یہ لوگ اتنے زیادہ عبادت گزار ہیں کہ عبادت کے آثار، تقویٰ کے آثار، خدا پرستی کے آثار ان کے چہروں سے عیاں ہیں۔ ان کو دیکھنے والا ہر شخص ان کے وجود میں خدا کی معرفت اور خدا کی یاد کا انتارہ کرتا ہے، اور انہیں دیکھ کر یادِ خدا میں ڈوب جاتا ہے۔

شاید رسول کریمؐ ہی سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عیینؐ کے حواریوں

نے ان سے سوال کیا: یا روح اللہ! مَنْ تُجَالِسَ؟ (اے روح اللہ! ہم کس قسم کے لوگوں کے ساتھ میل جوں رکھیں؟)۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا: مَنْ يُذَكِّرْ كُمُ اللَّهُ رَوِيَتْهُ وَيَزِيدُ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطَقَهُ وَيَرْغَبُكُمْ فِي الْخَيْرِ عَمَلَهُ (۱) (ایے شخص کے ساتھ میل جوں رکھو جسے دیکھ کر خدا کی یاد میں ڈوب جاؤ)، اسکی شکل و صورت پر، اسکے چہرے مہرے پر خدا ترسی کو دیکھو۔ علاوہ ازاں یزید فی علمکم منطقہ (جب وہ بات کرے تو اسکی باتوں سے استفادہ کرو، اسکی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کرے) یہ رغبکم فی الخیر عملہ (اسکا کردار دیکھ کر تمہارے اندر بھی نیک کاموں کا شوق پیدا ہو)۔

آگے چل کر آیت کہتی ہے: ذلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّسْوِرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَرَزْعُ أَخْرَاجَ شَطَاهَ فَارِدٌ، فَانْسْتَغْلَطَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الْرُّرَاعَ لِيغُيظُ بِهِمُ الْكُفَّارُ (یہی ان کی مثال تو ریت میں ہے اور یہی ان کی صفت انجیل میں ہے۔ جیسے کوئی کھیتی ہو جو پہلے سوئی نہاں پھر اسے مشبوط بنانے، پھر وہ موٹی ہو جائے اور پھر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے کہ کاشتکاروں کو خوش کرنے لگتا کہ ان کے ذریعے کفار کو جلا یا جائے۔ سورہ فتح ۲۸- آیت ۲۹)

توریت و انجیل میں ان کی یہی صفت بیان کی گئی ہے، ایک ایسی ملت کے وجود میں آنے کی بات کی گئی ہے۔ ان کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے، اس انداز میں تو صیف کی گئی ہے۔ ان کی مثال ایک زراعت کی مثال ہے، گندم کے ایک دانے کی مانند ہیں جسے زمین میں بویا جاتا ہے اور کیونکہ یہ دانہ زندہ ہوتا ہے اس لئے ایک بار ایک پتی کی صورت میں اپنا سر زمین سے باہر نکالتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ یک سخت پتے کی صورت اختیار کر لیتا

۱- اصول کافی- ج ۲- کتاب فضیل العالم، باب مجالس العلماء، وصحیحۃ تھیہ۔

ہے، اس میں مضبوطی اور استحکام آ جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک موٹی ڈالی بن جاتا ہے۔ اسکے بعد خود اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ابتدا میں وہ زمین پر پڑا ہوا ایک معمولی سا پتھر تھا، جسے ثبات و استحکام حاصل نہ تھا۔ بعد میں یہ ایسا پھلتا پھولتا ہے کہ انسان شناسی کے تمام ماہرین کو حیرت زدہ کر دیتا ہے اور وہ فکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ یہ کیسی پختہ اور شاندار قوم وجود میں آئی ہے۔ البتہ حیرت و استیغاب کا باعث ایسی ہی قوم ہو سکتی ہے جو اشداء علی الکفار بھی ہو، حماء بینہم بھی ہو اور رکعاً سجداء اور یتغون فضلاً من الله و رضوانا بھی ہو۔ اس میں یہ تمام صفات پائی جاتی ہوں۔

اب بتائیے ہم مسلمان اس قدر رزوں وال و انحطاط کا شکار کیوں ہیں؟ اس قدر بد بخت اور ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ بتائیے ان مذکورہ خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت ہمارے اندر موجود ہے؟ اور ہم کیا توقعات و ابستہ کئے ہوئے ہیں؟

معنویات کو خفیف نہ سمجھئے

ہمیں صدر صد اعتراف ہے کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے، اسکے احکام و فرائیں اسکے اجتماعی ہونے کے عکاس ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اس بات کا عصب نہیں ہو سکتی کہ ہم عبادت، دعا اور خدا سے ارتباط کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، انہیں معمولی سمجھنے لگیں، نماز کو بے اہمیت سمجھیں۔

نماز کو خفیف اور معمولی سمجھنا بھی ایک گناہ ہے۔ نماز نہ پڑھنا ایک بڑا گناہ ہے لیکن نماز پڑھنا مگر اسے خفیف سمجھنا، اسے بے اہمیت قرار دینا بھی ایک گناہ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کے بعد (آپ کے ایک صحابی) ابو بصیر تعزیت کی غرض سے ام حمیدہ کے یہاں حاضر ہوئے۔ ام حمیدہ رونے لگیں۔ ابو بصیر جو نا بینا تھے وہ بھی رونے لگے۔ اسکے بعد ام حمیدہ نے ابو بصیر سے کہا: اے ابو بصیر! تم نہ تھے، تم

نے اپنے امام کے آخری لمحات کو نہ دیکھا، اس وقت ایک عجیب قصہ ہوا۔ امام قریب قریب عالم غشی میں تھے، اسی اشنا میں آپ نے اپنی آنکھوں کو کھولا اور فرمایا: میرے تمام نزدیکی رشتہ داروں کو بلاو، سب کو میرے سرہانے جمع کرو۔ ہم نے امام کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سب لوگوں کو اکھٹا کیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو امام نے اسی عالم غشی میں، جبکہ آپ اپنی حیات مبارک کے آخری لمحات طے کر رہے تھے، اپنی آنکھوں کو کھولا، اردو گرد جمع ہونے والوں کی طرف رخ کیا اور صرف ایک جملہ ارشاد فرمایا: *إِنَّ شَفَاعَتَنَا لَا تَنَالُ مُسْتَحْفَفًا بِالصَّلَاةِ* (ہماری شفاعت کسی بھی صورت میں ان لوگوں کو نہ ملے گی جو نماز کو معمولی سمجھتے ہیں۔ وسائل الشیعہ، ج ۳۔ ص ۷۷۔ ح ۱۱)۔ امام نے صرف اتنا کہا اور جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

امام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہماری شفاعت ان لوگوں کو نہ ملے گی جو نماز نہیں پڑھتے۔ ان لوگوں کا معاملہ تو بالکل واضح (clear) ہے۔ بلکہ فرمایا کہ ایسے لوگ جو نماز کو سبک اور معمولی سمجھتے ہیں، وہ ہماری شفاعت نہ پاسکیں گے۔

کون لوگ ہیں جو نماز کو سبک اور معمولی سمجھتے ہیں؟ نماز کو معمولی چیز اور بے اہمیت سمجھنے والے لوگ وہ ہیں جنہیں وقت اور فرصت میسر ہوتی ہے، وہ اطمینان کے ساتھ ایک اچھے طریقے سے نماز پڑھ سکتے ہیں، لیکن ایسا نہیں کرتے۔ ظہر عصر کی نماز اس وقت پڑھتے ہیں جب سورج غروب ہونے کو ہوتا ہے۔ جب دیکھتے ہیں کہ سورج ڈوبنے کو ہے تو بھاگم بھاگ وضو کرتے ہیں، جبکہ پٹ نماز پڑھتے ہیں اور تیزی کے ساتھ سجدہ گاہ ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی نماز پڑھتے ہیں جس کا نہ مقدمہ ہوتا ہے نہ موندہ، نہ جس میں اطمینان ہوتا ہے نہ حضور قلب۔ ایسا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جیسے نماز بھی دوسرے معمولی کاموں کی طرح کا ایک کام ہے۔

یہ ہے نماز کو خفیف سمجھنا۔ ایسی نماز، اس نماز سے بہت زیادہ مختلف ہے جس کی

طرف انسان ذوق و شوق کے ساتھ جاتا ہے۔ جوں بھی ظہر کا اول وقت آتا ہے وہ مکمل اطمینان کے ساتھ جا کر وضو کرتا ہے، ایسا وضو جس میں تمام آداب کو ملحوظ رکھا گیا ہوتا ہے۔ اسکے بعد جانماز پر آ کر اذان و اقامت کہتا ہے اور سکون اور دل جمعی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ سلام کہہ کر فوراً ہی کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ اطمینان قلب کے ساتھ پچھہ دیر تعلقیات نماز پڑھتا ہے، ذکرِ خدا کرتا ہے۔۔۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ (اس گھر میں) اس کی نظر میں نماز کو احترام حاصل ہے۔

ایسے نمازی جو نماز کو خفیف قرار دیتے ہیں، یعنی حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں، وہ فجر کی نماز عین طلوع آفتاب کے وقت پڑھتے ہیں اور ظہر و عصر کی نماز غروب آفتاب کے وقت ادا کرتے ہیں، مغرب اور عشاء کی نماز نہیں رات کے چار گھنٹے گزر جانے کے بعد یاد آتی ہے۔ یہ لوگ برق رفتاری اور تیزی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے لوگوں کے پچھے سرے سے نماز پڑھتے ہی نہیں۔

آپ اگر حقيقی نماز گزار بنا چاہتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے پچھے بھی نماز کے پابند نہیں تو آپ کو نماز کا احترام کرنا چاہئے۔ ہم آپ سے صرف یہ تقاضا نہیں کر رہے کہ نماز پڑھئے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ چاہتے ہیں کہ نماز کا احترام کیجئے۔ اس مقصد کیلئے پہلے تو خود اپنے لئے گھر میں نماز پڑھنے کی ایک مخصوص جگہ بنائیے (یہ مستحب بھی ہے)۔ یعنی گھر میں ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیجئے جو آپ کی عبادت گاہ ہو، مصلانہ ایک چیز اپنے لئے بنائیے۔

جیسے پیغمبر نے نماز کے لئے ایک جگہ معین کی ہوئی تھی اگر ممکن ہو تو آپ بھی ایک کمرے کو نماز پڑھنے کی جگہ کے طور پر مقرر کر لیجئے۔ اگر گھر میں کمرے زیادہ نہ ہوں تو خود اپنے کمرے میں نماز کے لئے ایک خاص جگہ معین کر لیجئے۔ ایک پاک صاف جانماز وہاں رکھئے، نماز کے لئے کھڑے ہونے سے قبل اسے بیجا یئے۔ آپ کے یاں ایک مساوک بھی

ہو، ذکر پڑھنے کے لئے تسبیح بھی ہو۔

جب وضو کر رہے ہوں تو اسے بھی جلدی جلدی اور عجلت میں نہ کیجئے۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم علیٰ کے شیعہ ہیں۔ برادر عزیز! نام رکھ لینے سے علیٰ کا شیعہ نہیں ہوا جا سکتا، جس شخص نے حضرت علیٰ کے وضو کو بیان کیا ہے وہ کہتا ہے: علی بن ابی طالب جب وضو کے لئے تشریف لاتے اور ہاتھوں کو پانی میں ڈالتے (وضو کا پہلا مسح عمل یہ ہے کہ انسان اپنے دونوں ہاتھوں کو دھونے) تو فرماتے: بِسْمِ اللَّهِ وَبِسْمِ اللَّهِ أَجْعَلْنِي مِنَ التَّوَابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ (اللہ کے نام اور اللہ ہی کے سہارے سے۔ خدا یا! مجھے توبہ کرنے والوں میں قرار دے، مجھے پاکیزہ رہنے والوں میں قرار دے)

دو دن پہلے ہم نے توبہ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ توبہ کے معنی خود کو پاکیزہ کرنا ہیں۔ پانی رمز طہارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب علیٰ پانی کا رخ کرتے ہیں تو، توبہ کو یاد کر کے اپنے ہاتھوں کو صاف کرتے ہوئے، اپنی روح کی طہارت کی جانب متوجہ ہو کے، ہم سے کہتے ہیں کہ جب اس پانی، جب اس طہور، جب اس مادے کا سامنا کرو جسے خدا نے پاکیزگی کا ذریعہ قرار دیا ہے، جب اس مادے کی طرف جاؤ اور تمہاری نگاہ اس پر پڑے اور اپنے ہاتھوں کو اس سے دھوؤ اور پاک کرو تو یہ بات ذہن میں رکھو کہ ایک اور پاکیزگی بھی ہے، ایک اور پانی بھی ہے، وہ پاکیزگی روح کی پاکیزگی ہے اور وہ پانی، توبہ کا پانی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہاتھوں کو دھونے کے بعد علیٰ اپنے چہرے پر پانی ڈالتے اور فرماتے: اللَّهُمَّ بَيِّضْ وَجْهِي يَوْمَ تَسْوُدُ الْوُجُوهُ وَلَا تُسَوِّدُ وَجْهَنِي يَوْمَ تَبَيَّضُ فِيهِ الْوُجُوهُ۔

آپ اپنے چہرے کو دھوتے ہیں اور حسب ظاہر صاف کرتے ہیں۔ خوب! جب اپنے چہرے کو پانی سے دھوتے ہیں تو وہ سفید براق ہو جاتا ہے۔ لیکن علیٰ اسی پر اکتفا نہیں

کرتے، اسلام بھی اسی پر اکتفا کا قائل نہیں۔ یہ عمل درست ہے اور اس پر عمل بھی کرنا چاہئے لیکن ایک اور پاکیزگی کے ساتھ اور ایک اور نورانیت کے ہمراہ، چہرے پر ایک اور سفیدی ہونی چاہئے۔ فرماتے ہیں: خدا یا میرے چہرے کو اس دن روشن کر دینا جس دن چہرے سیاہ ہو جائیں (روز قیامت) اور اس دن چہرے کو سیاہ نہ کرنا جس دن چہرے روشن ہو جائیں۔

اس کے بعد بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کے فرماتے ہیں: **اللَّهُمَّ أَعْطِنِي كِتَابِي بِسَمِينِي وَالْخُلُدِ فِي الْجَنَانِ بِسَارِي وَ حَاسِبِنِي حِسَابًا يِسُورًا** (خدا یا! قیامت میں میرا نامہ اعمال میرے داہنے ہاتھ میں دینا) (کیونکہ کامیاب اور نجات یافتہ لوگوں کا نامہ اعمال ان کے راہنے ہاتھ میں دیا جائے گا) اور جنت مجھے آسانی سے عنایت فرمادینا، اور حساب میں بھی آسانی فرماتا۔ اس طرح آپ آخرت کے حساب کو یاد کرتے ہیں۔

اس کے بعد بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: **اللَّهُمَّ لَا تَعْطِنِي كِتَابِي بِشَمَالِي وَلَا مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي وَلَا تَجْعَلْهَا مَعْلُولَةً إِلَى عَنْقِي وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ مُقْطَعَاتِ النَّيْرَانِ** (خدا یا! میرے نامہ اعمال کو بائیں ہاتھ میں یا پشت کی طرف سے نہ دینا۔ (کچھ لوگوں کا نامہ اعمال انہیں پیچھے سے پکڑا یا جائے گا اور یہ بھی ایک رمز ہے) اور نہ میرے ہاتھوں کو میری گردن سے باندھ دینا۔ میں جہنم کی آگ کے قطعات سے تیری چاہنا چاہتا ہوں)

کہتے ہیں: اسکے بعد آپ نے سر کا مسح کرتے ہوئے فرمایا: **اللَّهُمَّ غَشَنِي بِرَحْمَتِكَ وَ بِرَحْمَاتِكِ** (خدا یا! مجھے اپنی رحمت اور برکتوں میں ڈیو دے)

پھر آپ نے پیر کا مسح کرتے ہوئے فرمایا: **اللَّهُمَّ ثَبِّتْ قَدَمَيِّي عَلَى الصِّرَاطِ يَوْمَ تَرْزِلُ فِيهِ الْأَقْدَامُ** (خدا یا! میرے ان قدموں کو صراط پر اس دن ثابت رکھنا جس

دن سارے قدم پھسل رہے ہوں گے) وَاجْعَلْ سَعْيِي فِيمَا يَرْضِكَ عَنِی (میرے عمل اور کدو کاوش کو ان کا مous میں قرار دینا جو تجھے راضی کر سکیں)

ایسا وضو جو اس قدر عشق و اشتیاق اور توجہ و اہتمام کے ساتھ کیا جائے گا، وہ (بارگاہِ الہی میں) ایک علیحدہ ہی انداز سے قبول کیا جائے گا، اور وہ وضو جو ہم اور آپ کرتے ہیں اسکی قبولیت کسی اور طرح کی ہوگی۔

پس نماز کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے، سبک نہیں شمار کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان دورانِ نماز صرف اسکے واجبات کی ادائیگی پر اکتفا کی کوشش کرے۔ (اور جب کوئی اسے اس جانب متوجہ کرے تو کہہ کرے) آؤ، دیکھیں، مرجع تقلید کا فتویٰ کیا ہے، کیا وہ کہتے ہیں کہ (دوسری اور تیسری رکعت میں) تین مرتبہ سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا اللہ الا اللہ، واللہ اکبڑو کہنا چاہئے، یا اسے ایک ہی مرتبہ کہنا کافی قرار دیتے ہیں؟

جی ہاں (درست ہے کہ)، مجتهد فتویٰ دیتے ہیں کہ اسے ایک ہی مرتبہ کہنا کافی ہے۔ البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ احتیاطِ مستحب یہ ہے کہ اسے تین مرتبہ کہا جائے۔ لہذا ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ جب مجتهد نے ایک مرتبہ کہنا کافی قرار دیا ہے تو ہم بھی صرف ایک ہی مرتبہ کہیں گے۔ یہ دراصل نماز سے جی چڑانا ہے۔ ہمیں ایسا ہونا چاہئے کہ اگر مجتهد ایک مرتبہ کہنا واجب قرار دے اور مزید دو مرتبہ کہنا مستحب سمجھے، تو ہم باقاعدہ ہوئے اس مستحب کو بھی انجام دیں ہے۔

روزے کو بھی معمولی اور خفیف نہیں بنادینا چاہئے۔ بعض لوگوں کا روزہ رکھنے کا ایک خاص انداز ہے (یہ میں از راہِ مذاق کہہ رہا ہوں) کہ نعوذ باللہ اگر میں خدا کی جگہ ہوں تو کسی صورت ان کا یہ روزہ قبول نہ کروں۔

میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ماہ رمضان میں رات بھر نہیں سوتے۔ البتہ ان کی یہ شب بیداری عبادات کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے جا گتے ہیں کہ ان کی نیند پوری نہ

ہو سکے۔ صبح تک چائے پینے اور سگر بیٹ نوشی میں وقت کزار تھے ہیں۔ صبح طلوع ہونے کے بعد اول وقت نماز فجر پڑھ کے سو جاتے ہیں اور (سارے دن سوکر) اُس وقت بیدار ہوتے ہیں جب ظہر اور عصر کی نماز کی ادائیگی کا انتہائی قلیل وقت باقی رہ جاتا ہے۔ اور پھر برق رفتاری سے یہ نماز میں پڑھنے کے بعد افطار کے سامنے آبیٹھتے ہیں۔

آخر یہ کس قسم کا روزہ ہے؟

انسان دست بھر صرف اس لئے نہ سوئے کہ دن میں روزہ رکھ کر سوتا رہے، تاکہ روزے کی سختی اور مشقیت محسوس نہ کرے۔
کیا یہ روزے کو معمولی سمجھنا نہیں؟

میرے خیال میں تو یہ روزے کو گالی دینے کے مترادف ہے، یعنی یہ تو زبان حال سے یہ کہنا ہے کہ اے روزے! میں تجھ سے اس قدر نفرت کرتا ہوں کہ تیرا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا!!

ہم حج کرتے ہیں لیکن حقارت کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں لیکن معمولی بنا کے، نماز پڑھتے ہیں لیکن سبک کر کے، اذان کہتے ہیں لیکن بے حیثیت انداز میں۔
دیکھئے، ہم اذان کو کیسے بے حیثیت کرتے ہیں؟

موذن کا ”صیست“، یعنی خوش آواز ہونا مستحب ہے۔ اسی طرح جیسے قرآن مجید کی قرائت کے لئے تجوید یعنی حروف قرآن کی خوبصورتی کے ساتھ ادائیگی، خوبصورت آواز میں قرآن پڑھنا سنت ہے، جو روح پر بھی بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح اذان میں بھی مستحب یہ ہے کہ موذن ”صیست“، یعنی خوش آواز ہو، اس انداز سے اذان کہے کہ سننے والوں پر وجد طاری کر دے، ان میں خدا کی یاد تازہ کر دے۔

بہت سے افراد خوش آواز ہیں اور اپنے انداز میں اذان کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ جناب آگے بڑھے، آج آپ اذان کہہ دیجئے تو وہ تیار نہیں

ہوتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ دل بی دل میں کہتے ہیں کہ کیا میں اس قد رحیقِ شخص ہوں کہ موزن ہوں؟

جناب! موزن ہونے پر تو آپ کو فخر کرنا چاہئے، علی ابن ابی طالب موزن تھے۔

جس دور میں آپ خلیفہ تھے، اس دور میں بھی اذان کہا کرتے تھے۔ موزن ہونے کو اپنی تو ہیں سمجھنا، یا موزن ہونے کو کسی خاص طبقے سے وابستہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ میں جو اشراف و عمالک دین میں سے ہوں، رجال و شخصیات میں میرا شمار ہوتا ہے، میں اذان دوں؟۔۔۔ یہ سب باتیں اذان کی تحقیر کرنا اور اسے تحقیر سمجھنا ہیں۔

پس ہمیں کسی بھی صورت میں عبادات کی تحقیر نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں ایک کامل اور جامع مسلمان ہونا چاہئے۔ اسلام کی ایثربیت اور قدر و قیمت اسکی جامعیت میں ہے۔ نہ تو ہمارا کردار یہ ہو کہ صرف عبادات سے چھکیلے ہیں، اسکے ساتھ تمام چیزوں کو ترک کر دیں اور نہ ہی ہمیں دور حاضر میں پیدا ہونے والے ان بیوگملی کی مانند ہونا چاہئے جنہیں اسلام کی صرف ا۔ یہ تعلیمات ہی نظر آتی ہیں اور عبادات کی تحقیر کرنے لگیں۔

انشاء اللہ آئندہ شب جب ہم اسی بحث کے تسلسل میں عرائض پیش کریں گے تو دوسرے تمام اسلامی فرائض کی نظر سے عبادت کی اہمیت پر گفتگو کریں گے۔ اور واضح کریں گے کہ خود عبادات خدا کے تقرب کا ایک رکن اور مرکب (سواری) ہونے کے علاوہ، نیز علاوہ اس کے کہ ”وَاقِمِ الصَّلَاةِ لِذِكْرِي“، (۱) نماز کا مقصد یا دخدا اور تقرب الہی ہے اور دخدا کا تقرب اور اس سے نزدیکی خود اتنا بڑا مقصد ہے کہ اسے اپنے سے بڑھ کر کسی اور مقصد کی ضرورت نہیں (خود یہی اعلیٰ ترین مقصد ہے)۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اگر ہم عبادات کی تحقیر کریں تو دوسرے تمام فرائض کی ادائیگی سے بھی رہ جائیں گے۔ عبادات

۱۔ اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ سورہ طہ۔ ۲۰ آیت۔ ۱۳۔

تمام دوسرے اسلامی احکام و فرائیں کی قوہ مجریہ اور ان کے اجرائی ضامن ہے۔
یہیں پر ہم اپنے عرائض ختم کرتے ہیں۔

خدا یا! تجھے تیری درگاہ کے عبادت گزار بندوں کے حق کا واسطہ ان صاحبائیں قرآن
کے صدقے، اپنے پاکیزہ اور مخلص مناجات کرنے والوں کے صدقے، ہم سب کو حقیقی
عبادت گزاروں میں قرار دے۔

بِاِلٰهٖ اَكْبَرِ میں دین اسلام کی جامعیت سے آشنا فرم اور ہمیں ایک جامع مسلمان
بنادے۔

پروردگار! ہم سب کو خلوص نیت کی توفیق کرامت فرم۔
اللہی! ان محترم شہوں میں ہمارے گناہوں کو بخش دئے ہمارے مرحومین کی معرفت
فرما۔

”رَحِمَ اللَّهُ قَرَا الْفَاتِحَةَ مَعَ الصَّلَوَاتِ“



عبدت و نماز

۲۲

jabir.abbas@yahoo.com

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ طَوْلَدِكُرُ اللَّهِ أَكْبَرُ“

”بے شک نماز ہر برائی اور بیدکاری سے روکنے والی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی شے ہے۔“ (سورہ عنکبوت آیت ۲۹-۳۰) (۲۵)

عبادت اور تربیت

اسلام میں عبادات اصل اور بنیاد کی حامل ہونے کے ماتحت ساتھ اسکی تربیتی اسکیم کا حصہ بھی ہیں۔ اس بات کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ عبادات کے اصل اور بنیاد کے حامل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ہر پہلو سے قطع نظر، انسانی زندگی کے مسائل سے قطع نظر خود عبادت مقاصدِ خلقت میں سے ہے۔

”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْأَنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ“

”اور میں نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔“ (سورہ ذاریات آیت ۵۱-۵۲)

عبادت انسان کے حقیقی کمال اور تقریبِ الہی کا ایک وسیلہ ہے۔

ایسی چیز جو خود انسان کے کمال کا مظہر، اور خود ہدف اور غایت ہے اسکے لئے

ضروری نہیں کہ وہ کسی دوسری چیز کا مقدمہ اور وسیلہ ہو۔ لیکن اسکے باوجود عبادات اس اصلاح کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری چیز کا مقدمہ بھی ہیں۔ یعنی جیسا کہ ہم نے عرض کیا (عبادات) اسلام کی تربیت اسکیم کا حصہ ہیں۔ یعنی اسلام، جو اخلاقی اور اجتماعی لحاظ سے افراد کی تربیت کرنا چاہتا ہے، وہ اس مقصد کے لئے جو وسائل اختیار کرتا ہے ان میں سے ایک وسیلہ عبادت ہے اور اتفاق سے یہ وسیلہ انسان کے اخلاق اور روح پر ہر دوسرے وسیلے سے بیش از انداز ہوتا ہے۔ ایسا کس طرح ہے؟ ہم آئندہ سطور میں اس کی وضاحت کریں گے۔

اخلاقی مسائل کا محور ”انیاد و فدا کاری“، اور اپنے فائدے اور مفاد کو پس پشت رکھنا ہے۔ جس طرح ”حمسیہ“، یعنی پرخوری سے اجتناب، جسمانی سلامتی کا ایک اصول ہے، جو (جسمانی صحت سے متعلق) تمام خوبیوں کی اساس اور بنیاد ہے، اسی طرح اخلاق میں بھی ایک چیز ہے، جو تمام اخلاقی مسائل کی اصل اساس ہے، اور وہ ہے اپنی ذات سے گزر جانا، اپنی ذات کو بھلا دینا، ”انانیت“ کی اسیری سے آزاد ہو جانا اور ”میں“، کو ترک کر دینا۔ اجتماعی مسائل میں عدالت کا اصول تمام اصولوں کی ماں ہے۔ عدالت، یعنی دوسرے افراد کے حق کو ملحوظ رکھنا، ان کے حقوق کی رعایت کرنا۔

وہ مشکل جس سے انسانیت اخلاقی مسائل میں بھی دوچار ہے اور اجتماعی مسائل میں بھی اس کا سامنا کر رہی ہے، وہ ان اصولوں کو رو بہ عمل لانے کا مسئلہ ہے۔ یعنی کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو اخلاق سے ناواقف ہو، یا اس بات کا علم نہ رکھتا ہو کہ عدالت کس درجے ضروری ہے۔ لیکن مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ان اصولوں پر عمل کا مرحلہ آتا ہے۔ جس وقت انسان کسی اخلاقی اصول کی پابندی کرنا چاہتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ اس کا مفاد اور منفعت ایک طرف ہے اور اس اخلاقی اصول کی پابندی دوسری طرف۔ وہ دیکھتا ہے کہ راست گوئی ایک طرف ہے اور منفعت اور فائدہ دوسری طرف۔ یا تو وہ جھوٹ

بولے، خیانت کرے اور نفع حاصل کر لے، یا پھر سچ بولے، امانت داری کا ثبوت دے اور اپنے منافع کو پس پشت ڈال دے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ عدل و اخلاق کا دم بھرنے والا انسان بھی عمل کے موقع پر اخلاق اور عدالت کی مخالف را اختیار کرتا ہے۔

ایمان کی تاثیر

جو چیز اخلاق اور عدالت کی پشت پناہ اور رحمات ہے، اور جو اگر انسان میں پیدا ہو جائے تو انسان با انسانی اخلاق اور عدالت کے راستے پر قدم بڑھا سکتا ہے اور اپنے نفع اور مفاد سے مستبردار ہو سکتا ہے، وہ صرف ”ایمان“ ہے۔

البته کونسا ایمان؟ جی ہاں ”خود عدالت پر ایمان، خود اخلاق پر ایمان۔

انسان میں عدالت پر ایک مقدس امر کے طور پر، اخلاق پر ایک مقدس امر کے طور پر ایمان کب پیدا ہوتا ہے؟

(یہ ایمان) اس وقت (پیدا ہوتا ہے) جب وہ تقدس کی اصل و اساس یعنی ”خدا“ پر ایمان رکھتا ہو۔ لہذا انسان عملاً اتنا ہی عدالت کا پابند ہوتا ہے جتنا خدا کا معتقد ہوتا ہے، عملاً اتنا ہی اخلاق کا پابند ہوتا ہے جتنا خدا پر ایمان رکھتا ہے۔

ہمارے دور کی مشکل یہی ہے کہ (لوگ) سمجھتے ہیں کہ ”علم“ کافی ہے۔ یعنی با اخلاق اور عادل ہونے کیلئے ہمارا عدالت اور اخلاق سے واقف ہونا اور ان کا علم رکھنا ہی کافی ہے۔ لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ اگر علم سے ایمان کا رشتہ ٹوٹا ہوا ہو تو یہ عدالت اور اخلاق کے لئے نہ صرف مفید نہیں، بلکہ مضر بھی ہے۔ اور ”سنائی“ کے اس قول کے مصدق ہو جاتا ہے کہ: چودڑا بچرا غ آید گزیدہ تر بردا کالا (جب چور چرا غ کے ہمراہ آتا ہے تو اچھی طرح چن چن کے مال لے جاتا ہے)

لیکن اگر ایمان پیدا ہو جائے تو اخلاق اور عدالت میں استحکام آ جاتا ہے۔ مذہبی

ایمان کے بغیر اخلاق اور عدالت ایسے ہی ہے جیسے بغیر خمانت کے کرنی نوٹوں کا جاری کر دینا۔ جب مذہبی ایمان آ جاتا ہے تو اخلاق اور عدالت بھی آ جاتے ہیں۔

یہیں پہنچ کر ہمیں نظر آتا ہے کہ اسلام نے خدا کی پرستش اور عبادت کو اخلاق اور عدالت سے جدا ایک علیحدہ مسئلہ قرار نہیں دیا ہے۔ یعنی جس عبادت کا اسلام حکم دیتا ہے اسکی چاشنی اخلاق اور عدالت کو قرار دیتا ہے۔ یا یہ کہیں کہ جس عدالت اور اخلاق کو تجویز کرتا ہے اسکی چاشنی عبادت کو قرار دیتا ہے کیونکہ اسکے بغیر یہ ممکن نہیں۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں: آپ کو کہاں، اور دنیا میں پائے جانے والے مکاتیب و ادیان میں سے کس مکتب اور دین میں یہ بات نظر آتی ہے کہ ایک مجرم خود اپنے قدموں سے چل کر آئے اور اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرے؟ مجرم تو ہمیشہ سزا سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ واحد قدرت جو مجرم کو خود اپنے قدموں پر چلا کے اور اپنے ارادے اور اختیار سے سزا کی طرف لا تی ہے وہ ”ایمان“ کی طاقت ہے اسکے سوا کوئی اور چیز ایسا نہیں کر سکتی۔

جب ہم اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسی بکثرت مثالیں نظر آتی ہیں۔ البتہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں تو اس سے صراحت یہ نہیں ہے کہ اس ابتدائی دور کے سوا کسی اور دور میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔ نہیں، صدراً اسلام کے علاوہ دوسرے ادوار میں بھی، لوگوں میں پائے جانے والے ایمان کے تناسب سے ایسی مثالیں موجود ہیں۔

اسلام نے مجرم کے لئے سزاوں کا تعین کیا ہے۔ مثلاً شراب نوشی کے مرتكب فرڈ زنا کار اور چور کے لئے سزا میں معین کی ہیں۔ دوسری طرف اسلام میں ایک اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ **الْحَدُودُ تَذَرُّ أُبَالشَّبَهَاتِ** یعنی حدود معمولی شبے پر دفع ہو جاتے ہیں۔ اسلام قاضی اور حاکم کو اس بات کا پابند نہیں کرتا کہ وہ مجرم کو تلاش کرنے کے لئے جاسوئی

کریں، تجسس کریں۔ بلکہ مجرم کے دل میں ایک طاقت ڈالتا ہے جس کے اثر سے وہ خود اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں، امیر المؤمنینؑ کے دور میں کثرت کے ساتھ ایسا ہوا کرتا تھا کہ لوگ خود پیغمبر یا امام کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہؐ (یا امیر المؤمنینؑ) ہم فلاں جرم کے مرتكب ہوئے ہیں، ہمیں سزا دیجئے۔ ہم آلو دہ ہیں، ہمیں پاک کر دیجئے۔

ایک شخص رسول اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے زنا کیا ہے، مجھے سزا دیجئے۔ کیونکہ اس قسم کے مسائل میں ایسے شخص کے لئے چار مرتبہ اقرار کرنا ضروری ہے، ایک مرتبہ کا اقرار کافی نہیں، لہذا) پیغمبرؐ نے فرمایا: **لَعَلَّكَ قَبِيلْتُ** شاید تم نے اس عورت کا بوسہ لیا ہوگا اور کہہ رہے ہو کہ میں نے زنا کیا ہے (یعنی آنحضرتؐ اسکے منہ میں الفاظ رکھ رہے ہیں)۔ **أَكَوْدُهُ** کہے کہ ہاں میں نے بوسہ لیا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ بوس و کنار بھی زنا کی مانند ہے اور معاملہ صرف نہیں پر ختم ہو گیا ہوگا۔ اس نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسول! میں نے زنا کیا ہے۔ فرمایا: **لَعَلَّكَ غَمْزُتُ** شاید تو نے براٹی کا صرف ارادہ کیا ہوگا، یا اسکے جسم کو ٹوٹا ہوگا۔ (شاید وہ بے کہ ہاں، ایسا ہی تھا، اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں کیا تھا)۔ اس نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسول! میں زنا کا مرتكب ہوا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: شاید تو زنا کے قریب قریب پہنچ گیا ہو اور درحقیقت زنا واقع نہ ہوا ہو؟ اس نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسول! میں آلو دہ ہوا ہوں، میں ناپاک ہو گیا ہوں۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ آپؐ مجھ پر حد جاری فرمائیں اور اسی دنیا میں مجھے سزا دیں، میں نہیں چاہتا کہ میرا یہ جرم دوسری دنیا میں میرے ساتھ جائے۔

یہ حدیث جسے ہم اب پیش کر رہے ہیں ”کافی“ میں ہے (فروع کافی - ج ۷ - ص

(۱۶۵)

ایک عورت امیر المؤمنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: اے امیر المؤمنین! میں

نے زنائے محسنه کا ارتکاب کیا ہے، میں شادی شدہ ہوں، شوہر کی غیر موجودگی میں زنا کی مرتكب ہوئی ہوں اور اسکے نتیجے میں حاملہ ہو گئی ہوں۔ ”طہر نی“، مجھے پاک کر دیجئے، میں آلوہ ہوں۔ امام نے فرمایا: ایک مرتبہ کا اقرار کافی نہیں، چار مرتبہ اقرار کرنا ضروری ہے (۱) پھر یہ کہ اگر ایک شادی شدہ عورت زنا کی مرتكب ہو تو اسے ”رجم“، یعنی سنگسار کیا جائے گا۔ میں اگر تمہیں سنگسار کرنے کا حکم دون گا تو اس بچے کا کیا بنے گا جو تمہارے شکم میں ہے؟ بچے کو تو ہم سنگسار نہیں کر سکتے۔ تم جاؤ، بچے کی پیدائش کے بعد آنا، ہم اس بچے کی وجہ سے تمہیں سنگسار نہیں کر سکتے۔ یہ سن کرو ہ عورت چلی گئی۔

چند ماہ بعد دیکھتے ہیں کہ وہی عورت چلی آ رہی ہے، ایک بچہ بھی اس کی گود میں ہے۔ کہتی ہے: یا امیر المؤمنین طہر نی اے امیر المؤمنین! مجھے پاک کر دیجئے۔ بولی، میرا عذر یہ بچہ تھا، اب یہ دنیا میں آ چکا ہے (یہ دوسرا اقرار تھا)۔ امیر المؤمنین نے فرمایا: اب اس موقع پر اگر ہم تجھے سنگسار کر دیں تو اس بچے کا کیا قصور ہے؟ ابھی اسے ماں کی ضرورت ہے، اسے ماں کا دودھ چاہتے، یہ ماں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا طالب ہے۔ فی الحال جاؤ، ابھی اس بچے کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ عورت دل شکستہ اور رنجیدہ حالت لئے لوٹ گئی۔

ایک دو سال بعد وہ عورت دو بارہ آئی، بچہ بھی اسکے ساتھ تھا اور اس کے کہنے لگی: یا امیر المؤمنین! طہر نی، اب میرا بچہ دودھ نہیں پیتا، اسے دودھ پلانے والی کی ضرورت نہیں رہی، بڑا ہو گیا ہے۔ اب مجھے پاک کر دیجئے۔ فرمایا: نہیں، ابھی اس بچے کو ماں کی ضرورت ہے۔ ابھی جاؤ۔ یہ سن کر اس عورت نے بچے کا ہاتھ پکڑا، اب وہ روئی

(۱) اسلام میں کسی صورت حتیٰ قاضی تک کو اس بات کی اجازت نہیں کرو، تجسس کرے یا بہانے سے اقرار لے بلکہ جب کوئی انسان اقرار کرتا ہے تو قاضی ایک بہانے کے ذریعے اسکے اقرار کو مسترد کرتا ہے۔

جاتی تھی اور یہ کہتی جاتی تھی کہ: خدا یا! یہ تیسری مرتبہ ہے کہ میں گناہ کی اس آلووگی سے پاک ہونے کی غرض سے تیرے (مقرر کردہ) امام کی خدمت میں آئی ہوں، خلیفہ مسلمین کے پاس آئی ہوں اور وہ ہیں کہ ہر مرتبہ ایک بہانہ کر کے مجھے واپس لوٹا دیتے ہیں۔ بار الہا! میں اس گندگی سے چھکا را چاہتی ہوں، میں آئی ہوں کہ وہ مجھے سنگار کریں اور میں پاک ہو جاؤں۔ وہ یہ کہتی ہوئی جا رہی تھی کہ اتفاقاً اس پر عمرہ بن حریث کی نگاہ پڑ گئی، یہ ایک منافق انسان تھا۔ اس نے عورت سے پوچھا: کیا ہوا؟ کیا معاملہ ہے؟ عورت نے پورا قصہ کہہ سنا یا۔ عمرہ بن حریث نے کہا: آؤ میرے ساتھ، میں تمہارا مسئلہ حل کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ بچہ میرے حوالے کر دو، میں اس کی کفالت قبول کرتا ہوں۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ علی اس عورت سے چوتھی مرتبہ اقرار لینا نہیں پاہتے۔

امام دیکھتے ہیں کہ وہ عورت اپنے بچے اور عمرہ بن حریث کے ساتھ واپس چلی آ رہی ہے۔ آپ کے نزد یہ آتی ہے اور کہتی ہے: یا امیر المؤمنین! طھوڑی (اے امیر المؤمنین! مجھے پاک کر دیجئے)، میں نے زنا کیا ہے (بچہ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے، اس شخص نے اسے پالنے پوئے کی ذمہ داری لے لی ہے، اب آپ مجھے پاک کر دیجئے)۔۔۔ کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین کو معااملے کا یہاں تک پہنچنا بہت ناگوارگزرا۔

یہ ایمان اور مذہب کی طاقت ہے جو انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں اثر انداز ہو کر اسے عدالت اور اخلاق کے سامنے جھکا دیتی ہے۔ عبادت اس لئے ہے تاکہ انسان کی ایمانی حیات کی تجدید ہو، اسکا ایمان تازہ ہو، اس میں طراوت اور نشاط پیدا ہو، وہ قوت اور طاقت حاصل کرے۔

جتنا انسان کا ایمان زیادہ ہو گا، اتنا ہی وہ خدا کو زیادہ یاد رکھے گا، اور جتنا انسان کو خدا یاد رہے گا اتنا ہی وہ گناہ کا کم مرتبہ ہو گا۔ گناہ اور نافرمانی کرنے یا نہ کرنے کا دار و مدار علم پر نہیں ہے، اسکا دار و مدار غفلت اور یاد پر ہے۔ جتنا انسان غافل ہو گا، یعنی اس نے

جتنا خدا کو فرماوش کر دیا ہو گا، اتنا ہی زیادہ وہ گناہ کا ارتکاب کرے گا اور جتنا زیادہ وہ خدا کو یاد رکھے گا، اتنی ہی اسکی نافرمانیاں کم ہوں گی۔

عصمت اور ایمان

آپ نے سنا ہوا ہے کہ انبیاء اور ائمہ معمصوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ انبیاء اور ائمہ کے معمصوم ہونے کے کیا معنی ہیں؟ تو آپ اسکا جواب دیں گے کہ وہ کبھی کسی بھی صورت میں گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔

ٹھیک ہے۔ (عصمت کے) معنی یہی ہیں۔ لیکن اگر اسکے بعد آپ سے سوال کیا جائے کہ (یہ لوگ) کیوں گناہ نہیں کرتے؟ تو ممکن ہے آپ اس سوال کا دو طرح سے جواب دیں۔ ایک یہ کہ انبیاء اور ائمہ اسکے وجہ سے معمصوم ہیں اور گناہ نہیں کرتے کہ خداوند عالم ان کے ارتکاب گناہ میں رکاوٹ ہے اس نے انہیں بالجبر گناہ اور معصیت سے روکا ہوا ہے۔ یعنی جب کبھی وہ گناہ کرنا چاہتے ہیں، خدا رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے اور ان کا راستہ روک دیتا ہے۔

اگر عصمت کے معنی یہ ہیں تو یہ (انبیاء اور ائمہ کے لئے) کوئی فضیلت اور کمال نہیں۔ اگر میرے اور آپ کے ساتھ بھی اسی طرح ہونے لگے کہ جوں بھی ہم گناہ کرنا چاہیں، خدا کی نافرمانی کرنا چاہیں تو ایک خارجی طاقت ہمارے راستے میں حائل ہو جائے، ہمارے مانع و مزاحم ہو جائے اور ہمارے اور گناہ کے درمیان رکاوٹ بن جائے۔ ایسی صورت میں بحالتِ مجبوری ہم بھی گناہ سے محفوظ رہیں گے۔

پس، ایسی صورت میں انہیں (انبیاء اور ائمہ کو) ہم پر کیا فضیلت ہوتی؟ اس صورت میں ان کے اور ہمارے درمیان صرف یہ فرق ہو گا کہ وہ خدا کے ایسے بندے ہیں جنہیں اس نے خاص امتیاز دیا ہوا ہے، جب وہ خدا کی نافرمانی کرنا چاہتے ہیں تو خدا ان کے

راستے میں حاصل ہو جاتا ہے لیکن (ہمیں یہ امتیاز حاصل نہیں) جب ہم نافرمانی کا ارادہ کرتے ہیں، تو خدا ہمارا راستہ نہیں روکتا۔

نہیں، یہ خیال غلط فہمی پر ہے۔ ان (انبیاء اور ائمہ) کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ گناہ کرنا چاہتے اور خدا ان کے مانع ہو جاتا ہے!

پس پھر حقیقت کیا ہے؟

عصمت کے معنی، ایمان کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہونا ہے۔ جتنا ایمان زیادہ ہو گا اتنا ہی انسان کو خدا زیادہ یاد رہے گا۔ مثلاً ایک بے ایمان انسان ایک روز گزارتا ہے ایک ہفتہ گزارتا ہے، ایک مہینہ گزارتا ہے، جو چیز اسکے ذمہ میں پھٹکتی تک نہیں، وہ خدا ہے۔ ایسا شخص یکسر غافل ہے۔

بعض لوگوں کو کبھی کبھی خدا یاد آتا ہے۔ اس موقع پر انہیں خیال ہوتا ہے کہ ہمارا ایک خدا ہے، خدا ہمارے سروں پر ہے اور وہ ہمیں دلکھر رہا ہے۔ لیکن خدا اسی ایک لمحے کے لئے ان کے ذمہ میں آتا ہے، اسکے بعد وہ اسے ایسے بھلا بیٹھتے ہیں جیسے سرے سے کسی خدا کا وجود بھی نہیں۔

لیکن کچھ افراد جن کا ایمان (مذکورہ بالا لوگوں سے کچھ) نہیں ہوتا ہے، کبھی غفلت میں ہوتے ہیں، کبھی بیدار۔ جب غافل ہوتے ہیں تو ان سے گناہ صادر نہیں ہوتے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو اس بیداری کے نتیجے میں ان سے گناہ صادر نہیں ہوتے۔ کیونکہ جب وہ خدا کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو ان سے گناہ کے صدور کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ لا یز نی ال ر بی وہو مو من (کوئی حالت ایمان میں زنا نہیں کر سکتا۔ وسائل الشیعہ۔

ج ۱-ص ۲۲-ح ۱۲)

جب انسان کی روح میں سچا ایمان موجود ہو اور وہ بیدار ہو تو گناہ میں بٹنا نہیں ہوتا۔ اب اگر انسان کا ایمان کمال کی حدود کو چھوٹے یہاں تک کہ وہ خدا کو بھیشہ حاضر و

ناظر سمجھنے لگے۔ یعنی خدا ہمیشہ اس کے دل میں موجود ہو، تو اس صورت میں وہ کبھی بھی غافل نہیں ہوتا، ہر عمل کی انجام دہی کے دوران خدا کی یاد اسکے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

”رِبَّ الْجَنَّاتِ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةً وَلَا يَجِدُونَ ذِكْرَهُ اللَّهِ“
 ”وَهُوَ مَرْدُ جَنَّاتِنَّ كَارُوبَارٍ يَا خَرِيدُ فَرِودٍ وَخَتْرَهُ خَادِسَ غَافِلٌ نَّهِيَّنَ كَرْسَكَتِيَّ۔“
 (سورہ نور ۲۲- آیت ۳۷)

(قرآن) یہ نہیں کہتا کہ وہ لوگ جو تجارت نہیں کرتے۔ اسلام لوگوں کو تجارت اور کاروبار سے رونکنے کے لئے نہیں آیا۔ یہ نہیں کہتا کہ تجارت نہ کرو۔ اسکے برعکس حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ محنت کرو، کماو، کاروبار کرو، تجارت کرو۔ وہ لوگ جو خرید و فروخت کرتے ہیں، تجارت کرتے ہیں، کماتے ہیں، ملازمت کرتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کے باوجود ایک لمحے کے لئے بھی خدا سے غافل نہیں ہوتے ہیں، دکان کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوتے ہیں، چیزیں فروخت کرتے ہیں، تو لتے ہیں، بولتے ہیں، پیسے لیتے ہیں اور مال حوالے کرتے ہیں لیکن جس چیز کو وہ ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کرتے وہ ”خدا“ ہے۔ خدا ہمیشہ ان کے ذہن میں رہتا ہے۔

اگر کوئی ہمیشہ بیدار ہو، ہمیشہ خدا اسکے ذہن میں ہو، تو قدرتی بات ہے کہ وہ کبھی بھی گناہ کا مرتکب نہیں ہوگا۔ البتہ ہم ایسی دائیگی بیداری مخصوصوں کے سوا کسی اور میں نہیں پاتے۔ (چنانچہ) مخصوصوں یعنی وہ لوگ جو کسی بھی لمحے خدا کو نہیں بھولتے۔

آپ کی خدمت میں ایک مثال عرض کرتا ہوں: کیا کبھی آپ کے ساتھ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ (آپ نے جانتے بوجھتے) اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیا ہو، یا آگ میں کو دپڑے ہوں؟ اگر آپ کو معلوم نہ ہو، بے خبری میں ایسا ہو گیا ہو تو دوسری بات ہے۔ پوری زندگی میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہم میں سے کوئی ارادتا خود کو آگ میں جھوٹک دے۔ البتہ

اگر ہم خود کشی کرنا چاہیں تو (بات دوسری ہے)۔

ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ ہم بخوبی یہ بات جانتے ہیں کہ آگ کا کام جانا ہے، یہ جانتے ہیں کہ اگر آگ کے بھر کے شعلوں میں گر جائیں تو یقیناً زندگی سے با تھوڑی بیٹھیں گے۔ ہم قطعی اور یقینی طور پر اس بات کا علم رکھتے ہیں اور جوں بھی ہمیں آگ نظر آتی ہے یہ علم ہمارے ذہن میں حاضر ہو جاتا ہے اور ہم ایک لمحے کے لئے بھی اس سے غافل نہیں ہوتے۔ لہذا ہم اپنے آپ کو آگ میں جھوٹکنے سے معصوم ہیں۔ یعنی ہمیں حاصل یہ علم و یقین اور ایمان کہ آگ جلانے کی صلاحیت رکھتی ہے، ہمیں آگ میں کوڈ پڑنے سے باز رکھتے ہیں۔

جتنا ہم آگ کے جلانے کی صلاحیت پر ایمان رکھتے ہیں، اتنا ہی اولیائے خدا، گناہ کے جلانے کی صلاحیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہذا وہ معصوم ہوتے ہیں (کسی گناہ کے قریب نہیں جاتے)۔

اب جبکہ معصوم کے معنی معلوم ہو چکے ہیں تو اس بھلکا مقصد بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ ”عبادت اسلام کی تربیتی اسکیم کا حصہ ہے“۔ عبادت اس لئے ہے کہ انسان کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد خدا کی یاد دلائی جائے اور انسان کو جتنا خدا یاد ہو گا اتنا ہی زیادہ وہ اخلاق، عدالت اور حقوق کا پابند ہو گا۔ یہ ایک بالکل واضح (clear) بات ہے۔

اسلام، دنیا اور آخرت کا جامع

اب اپنی پوری توجہ اس موضوع پر مرکوز فرمائیئے کہ اسلام میں دنیا اور آخرت کس طرح باہم ملے ہوتے ہیں۔ اسلام مسیحیت کی طرح نہیں ہے۔ مسیحیت میں دنیا اور آخرت کا حساب جدا ہے۔ مسیحیت کہتی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں علیحدہ علیحدہ عالم ہیں۔ (ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے) یا یہ یا وہ۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں

ہے۔ اسلام آختر کو دنیا کے ساتھ اور دنیا کو آختر کے ہمراہ قرار دیتا ہے۔ مثلاً نماز ہی کو لے لیجئے، اس کا خالص اخروی پہلو یہ ہے کہ انسان خدا کو یاد کرے، خوف خدار کرے۔

حضرت قلب اور خدا کی جانب متوجہ ہونے کیلئے اس قدر ادب آداب کی ضرورت نہیں کہ انسان پہلے جا کے وضو کرے، اپنے آپ کو دھونے، صاف کرے۔ کیا خدا سے ملاقات کے لئے وضو اور پا کیزگی کوئی تاثیر رکھتی ہے؟ خدا کے حضور جانے کے لحاظ سے اس بات کی کوئی تاثیر نہیں کہ انسان کا منہ دھلا ہوا ہے یا نہیں، لیکن خداوند عالم فرماتا ہے: *إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ، فَاغْسِلُوْ أُوْجُوهُكُمْ وَأَيْدِيْكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ (۱)* پھر اسکے بعد نماز پڑھو۔

دیکھا آپ نے (اسلام نے) صفائی کو عبادت کے ساتھ ملادیا ہے: *وَإِنْ كُنْتُمْ* *خَيْرًا فَاعْلَمُواْ فِيْ (۲)* اور یہاں عبادت کے ساتھ پا کی نمازگی کا ذکر ہے۔

اگر آپ نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کی عبادت کی جگہ مساجع ہوئی چاہئے، غصب شدہ نہ ہو۔ وہ نماز جس پر کھڑے ہوگئے آپ نماز پڑھتے ہیں، وہ لاس ہے میں کہ آپ نماز ادا کرتے ہیں اسے حلال اور مساجع ہونا چاہئے۔ اگر آپ کے لباس کا ایک دھانگا جسی مٹی ہو، تو آپ کی نماز باطل ہو جائے گی۔ اس مقام پر عبادت کرو، کہاں قائم بھی ہے۔ خدا کی عبادت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ کیا جا رہا ہے کہ (لوگوں کے) حقوق کا بھی احترام کیجئے۔ یعنی اسلام کہتا ہے کہ میں الکی عبادت قبول ہی نہیں کرتا جس میں دھروں کے حقوق کا پا اس ولیا نظر کھا آگیا ہو۔

۱۔ ایمان والوں بھبھی نماز کے لئے حقوق پہلے اپنے پھر وہی کو اور کہیوں تک اپنے پا ٹھوکوں کو دھونے جوڑو،
ناگہو کہ۔ آیت ۱۔

۲۔ اور اگر جنابت کی حالت بیکھری تو اسی کی سوچ کرو۔ سورہ یاء نہہ۔ آیت ۱۔

لہذا جب نماز پڑھنے والا کوئی شخص، نماز پڑھنا چاہتا ہے تو پہلے یہ دیکھتا ہے کہ یہ گھر جس میں، میں ہوں، اسے میں نے کسی سے بالجبر تو نہیں ہتھیا یا؟ اگر جراحتا ہوں تو، تو میری نماز باطل ہوگی۔ پس اگر وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے تو مجبور ہے کہ پہلے اپنے لئے ایک ایسے گھر کا بندوبست کرے جو اسکے لئے حلال ہو۔ یعنی اسکے اصل مالک سے خریدا ہوا ہوئیا وہ (مالک) اسکے وہاں رہنے سے راضی ہو۔ وہ جس فرش پر کھڑا ہے، اس کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ اسکا لباس بھی اسیا ہی ہونا چاہئے، حتیٰ اگر ناداروں کے حقوق، خمس یا زکات (وغیرہ) بھی اس کے ذمے ہوں، تو انہیں بھی ادا کرے۔ اگر اس نے انہیں ادا نہ کیا ہوگا، تو بھی اسکی نماز باطل ہوگی۔

اسی طرح (اسلام) ہم سے کہتا ہے اگر نماز پڑھنا چاہتے ہو تو تم سب کو کعبہ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا ہوگا۔ کعبہ کہاں ہے؟ وہ اولین معبد جو دنیا میں خدا کی پرستش کے لئے بنایا گیا، کہاں واقع ہے؟ ان اول بیت و وضع للنَّاسِ لِلَّذِی بِبَكَّةَ مُبَارَّکَ (بے شک سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ مکہ میں ہے مبارک ہے۔ سورہ آل عمران ۳- آیت ۹۶)۔ تم سب پر اس اولین معبد اور مسجد کی سمت رخ کر کے کھڑا ہونا لازم ہے جسے خدا کے عظیم پیغمبر ابراہیم اور ان کے فرزند اسماعیل نے تعمیر کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم کعبہ کی طرف رخ کر کے کیوں کھڑے ہوں؟ کیا وہاں خدا ہے؟ کیا خدا (معاذ اللہ) خانہ کعبہ کے اندر ہے؟ قرآن مجید جو یہ کہتا ہے کہ: فَإِنَّمَا تُوَلُوا فَشَمَّ وَجْهَ اللَّهِ (۱)۔ تم جہاں کہیں رخ کر کے کھڑے ہو جاؤ، ویس خدا ہے، تم چاہے دائیں طرف رخ کرو یا باائیں طرف، خدا کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو۔ اور رخ کرو یا

۱۔ لہذا تم جس جگہ بھی قبلے کا رخ کر لو گے تبھوڑ ہیں خدا موجود ہے۔ سورہ بقرہ ۲۵- آیت ۱۱۵۔

نیچے، خدا کی طرف تمہارا رخ ہوگا۔ اور پیغمبر نے فرمایا ہے: اگر تمہیں رسی سے باندھ کر نیچے زمین کے ساتوں طبقے تک بھی لے جائیں تب بھی خدا کی طرف جاؤ گے۔ مشرق کی طرف جاؤ، تب بھی خدا کی طرف جاؤ گے، مغرب کی طرف جاؤ، تب بھی خدا کی طرف جاؤ گے، یہاں جو بیٹھے ہوئے ہو، خدا کے ساتھ ہو۔ خدا کی کوئی سمت نہیں۔

(اگر ایسا ہے تو) پھر ہم کعبہ کی طرف رخ کر کے کیوں کھڑے ہوں؟

(اسلام) کہتا ہے کہ آپ عبادت کی انجام دہی کے دوران ایک اجتماعی تعلیم و تربیت بھی حاصل کیجئے۔ آپ سب کو ایک نقطہ واحد کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا چاہئے، اگر ایسا نہ ہو تو ایک شخص ایک طرف رخ کئے کھڑا ہوگا اور دوسرا دوسری طرف اور یہ تفرقہ اور انتشار کی علامت ہے، لیکن اگر تمام لوگ ایک نقطے کی جانب رخ کر کے کھڑے ہوں، تو اسکا مطلب ہے کہ سب یکمیں۔

تمام مسلمانوں کی ایک ہی سمت اور جماعت یونی چاہئے، اس مقصد کے لئے کس نقطے کا انتساب کریں جس میں شرک کی یوبھی شہادتی جاتی ہو۔ (اسلام) کہتا ہے کہ اس نقطے کا انتساب کرو جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا یہ کہلا سکتے ہیں، تم نے عبادت کا احترام ملحوظ رکھا ہے، اس سمت رخ کر کے کھڑے ہو جو اپنی معبد ہے، مسجد کا احترام عبادت کا احترام ہے۔

پھر (اسلام) کہتا ہے کہ اگر عبادت کرنا چاہئے ہو تو اسکا ایک مشین اور خاص وقت ہے، اس میں سیکنڈوں کا بھی خیال رکھا جانا چاہئے۔ مجھ کی نماز کا وقت ملتوی مجھ کے آغاز سے لے کر ملتوی آنتاب کی ابتداء تک ہے۔ اگر تم نے جانتے ہو مجھے مجھ ملتوی ہونے سے ایک سینکڑ پہلے یا سورج ملتوی ہونے کے بعد نماز شروع کی تو تمہاری نماز باطل ہوگی، درست نہ ہوگی۔ نماز کو ان دو (وقتات) کے درمیان ہونا چاہئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کہیں کہ مجھے نیند آ رہی ہے، رات پھر کا جا گا ہوا ہوں، گوا بھی مجھ ملتوی ہونے میں ایک

گھنٹہ باقی ہے، یوں بھی خدا کو نہ تو نیند آتی ہے اور نہ بیداری کا اس سے کوئی تعلق ہے، کیا خدا طلوعین کے درمیان (معاذ اللہ) اپنا مخصوص لباس پہن کر نماز قبول کرنے کے لئے تیار ہو کے بیٹھتا ہے؟۔۔۔ خدا کے لئے تو تمام ساعات اور تمام لمحات مساوی ہیں : لا تَأْخُذْهُ سَنَةً وَلَا نُوْمً (۱)۔ لہذا کیونکہ میں نے رات جاگ کر گزاری ہے، بہت زور وں کی نیند آ رہی ہے، کیوں نہ آ دھے گھنٹے پہلے نماز پڑھلوں۔

نہیں جناب، وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اپنے مقررہ وقت کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔

کیا خدا کی نظر میں اس وقت یا اس وقت کے درمیان کوئی فرق ہے؟ نہیں،۔۔۔ ہاں، آپ کے لئے فرق ہے۔ نماز کے فریعے آپ کی تربیت مقصود ہے، اگر آپ رات کو دو بجے تک بھی بیدار رہے ہیں، تب بھی آپ کو طلوعین کے درمیان اٹھ کر نماز ادا کرنی چاہئے۔ یہی حال ظہر اور عصر کی نمازوں کا ہے (یہ بھی) قبل از وقت قبول نہیں، وقت گزرنے کے بعد بھی قبول نہیں۔ مغرب اور عشا کی نمازوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز تو عبادت ہے، خدا پرستی ہے، بھلا خدا پرستی کو ان معاملات سے کیا سروکار؟

نہیں جناب، اسلام میں خدا پرستی ان مسائل سے مربوط ہے۔ اسلام عبادت و پرستش اور دوسرے مسائل کے درمیان تفریق کا قائل نہیں۔

(ممکن ہے کوئی کہے کہ) میں نماز پڑھتا ہوں، لیکن نماز کے دوران گری یہ بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میں مصیبت میں بٹلا ہوں، پریشانی کا شکار ہوں، چاہتا ہوں کہ نماز کے درمیان کچھ آنسو بھالوں۔ یا کوئی بات میرے ذہن میں آ جائے، کوئی چیز دیکھوں اور بنس پڑوں

۱۔ اسے نہ نیند آتی ہے اور نہ اونگھ۔ سورہ بقرہ ۲۵۵۔

(اگر ایسا کروں) تو کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔

نہیں جناب، ایسا نہیں ہے۔ نماز احساسات کو ضبط کرنے کا مظہر ہے، حالت نماز میں جب آپ ایک نقطے کی سمت متوجہ ہوں تو اسی نقطے کی سمت متوجہ رہنا چاہئے۔ نہ دائیں، نہ باشیں، نہ پیچھے، حتیٰ اپنا سر ادھر ادھر گھمانے کا بھی حق نہیں، ایک چوکس (Alert) حالت میں کھڑے ہونا چاہئے۔

کیا نماز میں ہنسا اور رو یا جا سکتا ہے؟

نماز کے دوران میں چینے کا حکم کیا ہے؟

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی چیز عبادت کی روح سے متصادم نہیں۔ خدا کو یاد کر رہے ہیں ساتھ ساتھ بُخی آہی ہے، ہنسا چاہتے ہیں۔ رونا آر رہا ہے، رونا چاہتے ہیں۔ یادوں ان نماز کوئی چیز کھانا چاہتے ہیں۔

نہیں جناب، آپ کو اس تھوڑی سی مدت کے لئے مشق کرنی چاہئے تاکہ اس دوران آپ کو اپنے پیٹ پر کنٹرول ہو، اپنی بُخی پر کنٹرول ہو اپنے رونے پر کنٹرول ہو، اپنی بے نظمی پر کنٹرول ہو۔ یہ اجتماعی مسائل میں سے ہے، لیکن عبادت ہے۔ کیونکہ اسلام میں عبادت تریتی اسکیم کا ایک حصہ ہے، اس اصول کی رعایت کئے بغیر مقبول نہیں۔

کیا سکون کے ساتھ جم کے کھڑے ہونا چاہئے؟

بعض کہتے ہیں کہ عجیب بات ہے!!! میں نماز کی حالت میں حمد اور سورے کی تلاوت کرتے ہوئے اسکی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتا ہوں لیکن اگر اپنے جسم کو حرکت دوں، ایک پیڑا انھا کر دوسرے پیڑ پر رکھ لوں، اپنے آپ کو دائیں باشیں جنبش دوں، تو کہا جاتا ہے کہ تمہاری یہ نماز باطل ہے۔ رکوع یا سجود میں بھی اگر اپنے آپ کو بلاوں جلاوں، اپنے پیروں یا باتحوں کو حرکت دوں، تو کہتے ہیں کہ تمہاری یہ نماز باطل ہے۔ (کہتے ہیں) آرام اور سکون کے ساتھ نماز پڑھو۔ یعنی جب کھڑے ہو اور اللہ اکبر کہنا چاہو تو جب تک تمہارا بدن

سالکت نہ ہو جائے اس وقت تک اللہ اکبر نہ کہو۔ اگر ہلتے ہوئے اللہ اکبر کہا تو نماز باطل ہو گی۔ پہلے سکون سے کھڑے ہو، پھر اللہ اکبر کہو۔ اسکے بعد اگر ہلنا ہو تو ہلو یکن ہلتے وقت کوئی حرف زبان سے ادا نہ کرو، کوئی ذکر نہ کرو۔ اگر بالفرض تمہارے پاؤں میں درد ہو، یا تمہارے کسی اور عضو میں تکلیف ہو تو خاموش ہو جاؤ، پر سکون ہو جاؤ جب ٹھہر جاؤ تو پھر ذکر شروع کرو بسم اللہ الرحمن الرحيم، الحمد لله رب العالمين کہو۔ اگر نماز کے درمیان تمہارے پاؤں میں تکلیف ہو، تو ٹھہر جاؤ، خاموش ہو جاؤ، اسکے بعد دو بارہ وہیں سے شروع کرو۔ (نماز) سکون اور اطمینان کے ساتھ ہونی چاہئے۔ اس دوران تمہاری روح بھی پر سکون ہو اور تمہارا جسم بھی۔

آتے ہیں نماز کے دوسرے حصوں کی طرف۔

نماز خدا کی جاتب توجہ کا نام ہے۔ غیر خدا کی جانب توجہ شرک ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم سے کہا گیا ہے کہ نماز میں کہو: **السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ**، (ہم پر اور تمام صالح بندگان خدا پر ہمارا سلام ہو)۔ اس طرح ہم خدا کے تمام صالح اور نیک بندوں سے بھی، موافقت اور صلح و صفا کا اعلان کرتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں تمام اچھے لوگوں کے ساتھ مل جل کے باہمی محبت اور سلامتی کے ماتھرہنے کا اعلان کرتے ہیں۔ حالت نماز میں کہتے ہیں کہ ہم کسی صالح بندہ خدا سے دشمنی اور عداوت نہیں رکھتے۔ کیونکہ اگر ہم کسی صالح اور نیک انسان سے دشمنی اور عداوت رکھتے ہوں تو (اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم) خود صالح اور نیک نہیں۔

کچھ لوگوں کے خیال میں **السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ** کہنا بھی عبادت کی روح، (جو بارگاہ الہی میں حضور قلب کا اظہار ہے) سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں عبادت کی روح اور جسم تربیت مسائل سے گندھے ہوئے ہیں۔ نماز پر وردگار سے قرب کی سواری ہونے کے ساتھ ساتھ، تربیت کا مکتب و مدرسہ

بھی ہے۔ معنوی اور روحانی مسائل کے لحاظ سے انسان جتنا اپنے آپ کو اور دوسروں کو فرماوش کرے بہتر ہے لیکن اجتماعی نکتہ نظر سے دوسروں کو فرماوش نہ کرنا لازم اور ضروری ہے۔

سورہ حمد (۱) جو نماز کا لازمی جز ہے، اس میں ہم کہتے ہیں: **إِيَّاكَ نَعْبُدُو إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ**۔ یہ نہیں کہتے کہ: ایا ک اعبدو ایا ک استعین۔ ایا ک اعبد، اصطلاحاً متكلم واحد ہے اس کے معنی ہیں کہ خدا یا! میں صرف تیری پرستش کرتا ہوں، صرف تجھ سے مدد لیتا ہوں، لیکن ہم یہ نہیں کہتے، بلکہ کہتے ہیں: **إِيَّاكَ نَعْبُدُو إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** یعنی خدا یا ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں، صرف تجھ ہی سے مدد و استعانت طلب کرتے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں: خدا یا! میں تنہا نہیں ہوں، میں دوسرے تمام مسلمانوں کے ساتھ ہوں۔

اس طرح انسان عبادت کی حالت میں اسلامی معاشرے سے اپنی وابستگی اور پیوںگی کا اظہار کرتا ہے۔ کہتا ہے: خدا یا میں ایک دنہ نہیں ہوں، ایک نہیں ہوں، میں عضو ہوں، کل کا ایک جز اور ایک بدن کا حصہ۔ ”ہم“ ہوں ”میں“ نہیں ہوں۔ دنیا نے اسلام میں ”میں“، ”نہیں“ پایا جاتا ”ہم“، پایا جاتا ہے۔

ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں، صرف تجھ سے مدد کے خواستگار ہیں۔

خدا کی کبریائی

نماز کے دوسرے حصے بھی اسی طرح ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک درس ہے، تذکرہ اور یاد دہانی ہے۔

۱۔ ہر نماز میں سورہ حمد پڑھنا ضروری ہے۔ لا صلوٰۃ الا بفاتحة الكتاب (بغیر سورہ فاتحہ کے نماز درست نہیں)۔ دوسرے سورے کی جگہ پر کسی بھی سورے کا انتخاب کیا جا سکتا ہے، لیکن سورہ حمد پڑھنا لازم ہے۔

مثلاً آپ ”اللہ اکبر“ کے لفظ پر غور کیجئے۔

آخر وہ کونسا انسان ہے جو کسی عظیم شے کا سامنا ہونے پر اس سے مرعوب نہ ہو؟ انسان میں خوف پایا جاتا ہے۔۔۔ جب وہ کسی پہاڑ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے یا اسکی چوٹی پر کھڑے ہو کر نیچے نگاہ ڈالتا ہے، تو اس پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ سمندر کی بچھری ہوئی موجیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ جب کسی صاحب قدرت و بیت ہستی کو دیکھتا ہے، دبدبے اور جاہ ہشم کی مالک کسی ہستی کا سامنا کرتا ہے یا اسکی خدمت میں جاتا ہے، تو ممکن ہے اسکے حوالے باختیہ یہ بوجائیں، اسکی زبان میں لکنت آ جائے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔۔۔ اس لئے کہ وہ اس کی عظمت و بیت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کے لئے ایک طبیعی بات ہے۔

لیکن اللہ اکبر کہنے والا شخص، ایسا شخص جو اپنے آپ کو خدا کی کبریائی کی تلقین کرتا ہے، اسے کسی چیز یا کسی ہستی کی عظمت مرعوب نہیں لرتی۔ کیوں؟ کیونکہ ”اللہ اکبر“، یعنی ہر چیز سے بڑی بلکہ ہر تو صیف سے بڑی ذات، ذاتِ اقدس اللہ ہے، یعنی اس بات کا اظہار کہ میں خدا کو عظیم سمجھتا ہوں، اور جب میں خدا کو عظیم سمجھتا ہوں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ میرے سامنے اس کا نات کی تمام اشیا حقیر ہیں۔ اللہ اکبر کا لفظ انسان کو شخصیت عطا کرتا ہے، انسان کی روح کو بزرگی اور بلندی عطا کرتا ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: عَظَمَ الْخَالِقُ فِي أَنْفُسِهِمْ فَصَغَرَ مَا دَوَنَهُ فِي أَعْيُنِهِمْ (خالق ان کی نگاہ میں اس قدر عظیم ہے کہ ساری دنیا ان کی نگاہ ہوں سے گرگئی ہے۔ نیج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۱)۔ یعنی خدا اہل حق کی روح میں جلوہ افروز ہے لہذا ان کی نظر میں خدا کے سوا ہر چیز پست اور معمولی ہے۔

اس مقام پر آپ کے لئے ایک وضاحت عرض ہے:

چھوٹا اور بڑا ہونا ایک نسبی (Relative) امر ہے۔ مثلاً آپ حضرات جو اس

ہال میں تشریف فرمائیں، اگر یہاں آنے سے پہلے، اس سے ایک چھوٹے ہال میں (مثلاً اس سے ایک تھائی چھوٹے ہال میں) بیٹھے ہوئے تھے، تو یہ ہال آپ کو بہت بڑا محسوس ہو گا، لیکن اگر اسکے برعکس، پہلے آپ ایک ایسے ہال میں بیٹھے ہوں جو اس ہال سے تین گناہ بڑا تھا تو جب وہاں سے یہاں آئیں گے تو آپ کو یہ ہال بہت چھوٹا معلوم دے گا۔

انسان جب کبھی مختلف چیزوں کی چھوٹائی اور بڑائی کا موازنہ کرتا ہے تو ان میں چھوٹی دکھائی دینے والی چیزوں کو چھوٹا اور بڑی نظر آنے والی چیزوں کو بڑا اقرار دیتا ہے۔ لہذا ایسے افراد جو اپنے پروردگار کی عظمت و بزرگی سے آشنا ہیں اور اسکی عظمت کو محسوس کرتے ہیں، ان کی نظر میں خدا سے سوا ہر چیز حقیر اور چھوٹی ہے، بڑی نہیں ہو سکتی۔ سعدی نے بوستان میں بہت عالی بات کی ہے:

بِرْ عَارِفَانْ جَزْ خَدَا يَقِنْ نِيَتْ رَهْ عَقْلْ جَزْ يَقِنْ دَرْ يَقِنْ نِيَتْ
سعدی کہتے ہیں: اہل عرفان، خدا کے سوا کسی چیز کی حیثیت کے قابل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ کسی اور چیز کا سرے سے وجود بھی نہیں۔

”وحدت الوجود“ کے ایک معنی یہی ہیں کہ جب عارف کے سامنے خدا کی عظمت اور بزرگی واضح ہو جاتی تو وہ کسی بھی صورت میں نہیں کہہ سکتا کہ اسکے سوا کسی اور چیز کا بھی وجود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ”وہ“ وجود ہے تو ”اس“ کے سوا جو کچھ ہے وہ عدم ہے۔ سعدی نے بھی وجود کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔ بعد میں کہتے ہیں:

تَوَانَ گَفْتَنِ اِنَّ بِالْحَقَائِقِ شَنَاسْ وَلِيْ خَرْدَهْ گَيْرَنْدْ اِبْلِ قِيَاسْ
حقیقت شناس لوگ جانتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، لیکن وہ لوگ جو (ان کے خیال میں) اہل قیاس ہیں وہ ان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وحدت الوجود کس شے کا نام ہے؟

کہ پس آسمان و زمین چیستند بنی آدم و دیو و دد کیستند

اگر خدا کے سوا کسی اور چیز کا وجود نہیں، تو پھر زمین کیا ہے؟ آسمان کیا ہے؟ بنی آدم کیا ہے؟ دیو اور دوکیا ہے؟

پسندیدہ پرسیدی ای ہوشمند جو ابت گویم درایت پسند کے خورشید و دریا و کوه و فلک پری و آدمیزادو دیو و ملک ہمہ ہرچہ بستنداز آن کمترند کہ باہتیش نام ہستی برند کہتے ہیں میں جب یہ کہتا ہوں کہ خدا کے سوا کچھ اور نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آسمان و زمین انسان اور فرشتے کسی بھی شے کا وجود نہیں۔ تم کہتے ہو کہ میں دوسری اشیا کے وجود کا منکر ہو گیا ہوں، نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ اس (خدا) کی عظمت کو جان لینے کے بعد میں اسکے سوا جس چیز کو بھی دیکھتا ہوں اسے ہستی قرار دینے سے خود کو عاجز پاتا ہوں۔

کہ جائی کہ دریا ست من چیستم گراد ہست حقا کہ من نیستم جب آپ ”اللہ اکبر“ کہتے ہیں تو اگر اپنی روح اور دل کی گہرائی سے کہیں گے تو خدا کی عظمت آپ کے سامنے جسم ہو جائے گی۔ اگر آپ کے دل میں خدا کی عظمت و بزرگی پیدا ہو جائے تو پھر آپ کی نظر میں کسی اور کا عظمت و بزرگی کا حامل ہونا محال ہو گا، محال ہے کہ آپ کسی اور سے خوف کھائیں، کسی اور کے سامنے خضوع و خشوع کا اظہار کریں۔

یہی وہ پیزیر ہے جس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ خدا کی بندگی انسان کو آزادی عطا کرتی ہے۔ اگر انسان خدا کی عظمت اور بزرگی کو جان لے تو اسکا بندہ بن جاتا ہے اور خدا کی بندگی کا لازمہ خدا کے سوا ہر کسی سے آزادی ہے:

نشوی بندہ تانگر دی حر نتوان کرد مطرف پر را پر چند گوئی کہ بندگی چہ بود بندگی جز شکنگی نبود

خدا کی بندگی غیر خدا کی بندگی سے آزادی کے مترادف ہے۔ کیونکہ خدا کی عظمت اور بزرگی کے اور اک کا لازمہ غیر خدا کی حقارت اور اسکے بے قیمت ہونے کا اور اک ہے۔ اور جب انسان غیر خدا کو خواہ وہ کوئی بھی ہو، حقیر اور معمولی سمجھنے لگے تو محال ہے کہ جانتے ہو جھتے کسی حقیر کی بندگی کرے۔ حقیر کی بندگی کو انسان غلط عظیم سمجھتا ہے۔

نماز کے وسیرے اذکار جیسے سبحان اللہ، الحمد للہ، سبحان ربی العظیم و سبحانہ، سبحان ربی الاعلیٰ و سبحانہ اور تشهد وغیرہ، ہر ایک میں ایک رمز اور راز پوشیدہ ہے۔

ایک شخص نے حضرت علیؓ سے سوال کیا: ہم (نماز کی ہر رکعت میں) دو مرتبہ سجدہ کیوں کرتے ہیں؟ جس طرح ایک سہ تھہ رکوع کرتے ہیں اسی طرح ایک مرتبہ سجدہ کر لیں!!!؟

البته آپ جانتے ہیں کہ سجدے میں ازکر سے زیادہ خصوص و خشوع اور عاجزی و انگساری کا اظہار پایا جاتا ہے۔ کیونکہ سجدے میں انسان اپنے عزیز ترین عضو (انسان کا عزیز ترین عضو سر ہے، جس میں انسان کا مغز ہوتا ہے اور سر میں بھی عزیز ترین نقطہ پیشانی ہے) کو عبودیت اور بندگی کے اظہار کے طور پر پست ترین چیز لمحی خاک پر رکھتا ہے۔ اپنی پیشانی خاک پر رکھتا ہے اور اس طرح اپنے پروردگار کے سامنے اپنے معمولی اور حقیر ہونے کا اظہار کرتا ہے۔

اس شخص نے کہا: ہم نماز کی ہر رکعت میں دو مرتبہ سجدہ کیوں کرتے ہیں، خاک میں کیا خصوصیت پائی جاتی ہے؟

امیر المؤمنین نے (اسکے جواب میں) یہ آیت پڑھی: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَ فِيهَا نُعِيدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرُجُ جُنُكُمْ تَارِةً أُخْرَى (اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں پلٹا کے لے جائیں گے اور پھر دوبارہ اسی سے نکالیں گے۔ سورہ طہ ۲۰۔ آیت

۵۵)۔ اور پھر فرمایا: پہلی مرتبہ سجدے میں سر کر کر جب اور پڑھاتے ہو تو اس کا مطلب اس بات کا اظہار ہے کہ: **مُنْهَا خَلَقْنَاكُمْ** (ہم سب خاک سے خلق ہوئے ہیں) ہمارے اس پورے پیکر کی بنیاد خاک ہے، ہم جو کچھ بھی ہیں وہ اس خاک سے وجود میں آئے ہیں۔ جب دوسری مرتبہ اپنا سر خاک پر رکھتے ہو تو تمہارے ذہن میں یہ ہونا چاہئے کہ ایک دن تمہیں مر کر خاک میں واپس جانا ہے۔ اور جب دوبارہ خاک سے اپنا سر اٹھاتے ہو تو تمہارے ذہن میں ہونا چاہئے کہ ایک مرتبہ پھر اس خاک سے اٹھائے جاؤ گے۔

اہل خانہ کے حوالے سے ذمے داری

ایک اور نکتے کا ذکر کر کے اچھے عراوض ختم کروں گا:

میرا دل بہت چاہتا ہے کہ نماز جو دینہ میں ستوں ہے، ہم اسکی اہمیت کو جان لیں، سمجھ لیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہم اپنے اہل خانہ کی نماز کے ذمے دار ہیں۔ یعنی اپنے بیوی بچوں کی نماز کے ذمے دار ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد نہ اپنی نماز کا بھی ذمے دار ہے اور اپنے اہل خانہ کی نمازوں کا بھی، یعنی اپنے بیوی بچوں کی نمازوں کا بھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے: وَأَنذِلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (۱)۔ اے پیغمبر! اپنے اہل خانہ کو نماز کی تاکید کیجئے اور خود بھی نماز کے بارے میں صابر رہئے۔ یہ (حکم) صرف پیغمبر سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہم سب اس بارے میں ذمے دار ہیں۔

بچوں (کو نماز کا عادی بنانے کے لئے ان) کے ساتھ کیا کرنا چاہئے؟

اس سلسلے میں بچوں کو بچپنے ہی سے نماز کی مشق کرانی چاہئے۔ شریعت کا حکم ہے کہ

۱۔ اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دیں اور اس پر صبر کریں۔ سورہ طہ ۲۰۔ آیت ۱۳۲۔

بچوں کو سات سال کی عمر سے نماز کی مشق کراؤ۔ ظاہر ہے کہ سات سالہ بچہ صحیح طور سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ البتہ وہ نماز کی حرکات و سکنات ادا کر سکتا ہے، اسی عمر سے نماز کا عادی ہو سکتا ہے۔ (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی)۔ یعنی جوں بھی بچہ پر اندر میں کلاسوں میں آئے تو اسے اسکول میں نماز سکھانی چاہئے۔ گھر میں بھی اسے نماز سکھانا چاہئے۔ البتہ ایک بات پر توجہ رہے، اور وہ یہ کہ بچے کو بالجھر اور زبردستی نماز سکھانا، اسے اس طرح نماز پر آمادہ کرنا، نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔

کوشش کیجئے کہ آپ کے بچے ابتداء ہی سے شوق اور رغبت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ آپ ان کے اندر نماز سے لگای پیدا کریں، جس طرح بھی ممکن ہو بچوں کے لئے شوق کے اس باب فراہم کریں تاکہ وہ ذوق و شوق سے نماز پڑھیں۔ اس سلسلے میں ان کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کیجئے، انہیں انعام دیتے کہ انہیں سمجھتے کا اظہار کیجئے، بھال تک کہ بچہ کسی کو بھروسہ نہیں دیتا۔ اسی کے لئے اسے لمحہ دیدھیاں کریں۔

عوقبیت اس فریضے کے طبق، اس کا اگرچہ سچدھانہ ایجاد میں مدد ہے اور لگوں کو ایسا یاد رکھ دیجئے کہ اس میں اس کا ادارہ کیا گی اور اس کی کوئی مدد نہیں کریں۔

بچہ کو اسی ایجاد کے طبق میں اس کے لئے اس کی مدد کی جائے۔ اس کی مدد کی وجہ سے اس کو اس کی ایجاد کی وجہ سے مدد کی جائے۔

اگر ان کو اسی ایجاد کی وجہ سے مدد کی جائے تو اس کی مدد کی وجہ سے اس بچوں کے بیویوں کو اسی ایجاد کی وجہ سے مدد کر لے گی، اسی وجہ پر ایک عوامی کی جانب دیکھتے ہیں اسی وجہ سے اس کی مدد کی جائے۔

ایک عوامی کی جانب سے کوئی ایجاد کی وجہ سے مدد کی جائے کہ اس کی مدد کی وجہ سے اس بچوں کو اس کی مدد کی وجہ سے مدد کی جائے۔

آپ آقاوں کے سے انداز میں انہیں حکم دیں، اور انہیں دھمکا نہیں، ان کے سر پر سوار جو جائیں۔ نہیں، بلکہ ہر اس ذریعے سے استفادہ کیجئے جس کے بارے میں آپ سمجھتے ہوں کہ آپ کے بچوں کو نماز کی جانب راغب کرنے اور انہیں اس کا شوق دلانے کے سلسلے میں مفید واقع ہو گا۔

بھیں اپنے بچوں کے ساتھ مسجد جانے کا اہتمام کرنا چاہئے، تاکہ وہ مساجد اور عبادت گاہوں سے آشنا ہوں۔ خود ہم لوگ جو اپنے بچپنے ہی سے مساجد اور معابد سے آشنا تھے اب آج کے ان حالات میں کس قدر مسجد جاتے ہیں؟ ہمارے بچے سات برس کی عمر سے اسکوں جاتے ہیں، اسکوں سے بعد کانچ اور پھر یونیورسٹی لیکن کبھی انہوں نے مسجد میں قدم نہیں رکھا ہوتا، ایسی صورت میں کیا وہ مسجد جائیں گے؟ جی ہاں! یہ بچے لازماً مسجد سے دو دنہ میکھے سکے۔ اس صورت حال میکھا کیا آج پھر یونیورسٹی کر سکتے ہیں کہہ مساجد کے حمالات اچھے نہیں یا اشیلا (مزکی لہتہ عابات ہیں) خلیل حضرت معاویہ سب باعثیں کر سکتے ہیں (اس لئے ہم اپنے بچوں کو ان بھگوں سے دور رکھتے ہیں لیکن چیزوں (مساجد اور معابد) کو درست کرنا بھی ہمارا فریضہ ہے۔ فریضہ کسی مقام پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اپنی مساجد کی اصلاح بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

لیکن اس بات کو بھی کبھی فراموش نہ کیجئے گا کہ ہم پر خود اپنی نمازگی اور ایسی بھی فرضیہ اور اسی اپنے اہل خانہ کو نماز کا ہماری بھاننا بھی ہمارا فریضہ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم ان میں نماز کی جانب رفتہ اور لگائی پیدا کریں جسیں قدر انکوں ہونماز پڑھنے کے قوام اور خصوصیات اور نماز کے قسم سے اپنے بچوں کو آگاہ کریں۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ جب بعض اہل جہنم کو عذاب دیا جا رہا ہو گا تو ان سے یہ چھا جائے گا: **نَاسُكَلَّجَنَّمَ فَقَى مَفْلُوْلَ** (کسی چیز نے جنم میں بھٹکایا ہے) **قَالُوا إِنَّمَا** **نَكَّ مِنَ الْمُضْلَلِينَ وَلَمْ نَكَّ نَطْلَبُمُ الْمُسْتَكْبِتِينَ** (ہم نماز میں پڑھتے تھے مسکینوں

کو کھانا نہیں کھلاتے تھے) وَكُنَّا نَحْوَضَ مَعَ الْخَارِصِينَ (اغو باتوں کی جگہ پر جاتے تھے۔ سورہ مدثرہ ۲۵۲ آیت ۲۵۲) جہاں کہیں بھی دین مخالف باتیں کی جاتی تھیں، وہاں جا کر انہیں سنتے تھے، یا خود ایسی باتیں کرتے تھے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

یہاں سے سمجھو لیجئے کہ اسلام میں نماز کو اس قدر اہمیت کیوں حاصل ہے؟ کیوں پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ نماز اس خیمے کا ستون ہے؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر نماز قائم ہو اور اسکا صحیح صحیح اجراء ہو تو ہر چیز ٹھیک ہو جائے۔

حضرت علیؑ نے اپنی آخری وصیتوں میں، جنہیں آپؑ نے بارہا سنا ہوگا اور جو اللہ اللہ سے شروع ہوتی ہیں (یہ وصیتوں کرنے کے چند ہی لمحے بعد آپؑ نے جان، جان آفرین کے پر دکر دی تھی)۔ انہی وصیتوں میں آپؑ نے نماز کے بارے میں فرمایا: اللہ اللہ بالصلوٰۃ فَانَّهَا عَمُودُ دِینِکُمْ (نماز کے بارے میں اللہ سے ڈرنا کیونکہ وہ تمہارے دین کا ستون ہے۔ فتح البالاغہ۔ مکتوب ۲۷)

روزِ ما شورا کے بارے میں آپؑ نے سنا ہوگا اور جانتے ہوں گے کہ زیادہ تر شہادتیں تکہر کی نماز کے بعد واقع ہوئیں۔ یعنی ظہر کے وقت تک حضرت امام حسینؑ کے اکثر اصحاب امامؑ بنی باشم اور خود امام حسینؑ (جو سب سے آخر میں شہید ہوئے) زندہ تھے۔ ظہر سے پہلے امام حسینؑ کے فتنہ تیس اصحاب دشمن کی طرف سے ہونے والی ایک تیراندازی میں شہید ہوتے تھے اگر نہ امامؑ کے شکر کے باقی دوسرے افراد ظہر کے وقت تک بقیہ حیات تھے۔

اصحاب امام حسینؑ میں سے ایک شخص کو خیال آیا کہ تکہر کی نماز کی ادائیگی کا اول وقت آپنچا ہے۔ وہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یا ابا عبد اللہ! نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے بھارا دل پورتا ہے کہ آپؑ کی افتادتیں آخری نماز جماعت ادا کریں۔ امامؑ نے انظر اٹھا کر (آسمان کی طرف) دیکھی اور اس کو وقتنہ ہو چکنے کی تصدیق کی۔ نتیجے میں کہ

فرمایا: ذَكْرُتِ الصَّلَاةَ يَا: ذَكْرُتِ الصَّلَاةَ۔ اگر ”ذَكْرُتْ“ کہا ہو تو معنی ہوں گے کہ تمہیں نماز یاد آئی، اور اگر ”ذَكْرُتْ“ کہا ہو تو معنی کئے جائیں گے کہ تم نے مجھے نماز یاد دلائی ذَكْرُتِ الصَّلَاةَ جَعَلَكَ اللَّهُ مِنَ الْمُصَلِّيَّنَ (تم نے نماز یاد دلائی، خدا تمہیں نماز گزاروں میں سے قرار دے)

تصور کیجئے کہ ایک ایسا شخص جو سر بکف ہے، اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہے، ایسے مجاہد کے بارے میں امام دعا فرمائے ہیں کہ خدا تمہیں نماز گزاروں میں سے قرار دے۔ دیکھا آپ نے حقیقی نماز گزار کتنا عظیم مقام رکھتا ہے۔

فرمایا: ہاں، ہم نماز پڑھیں گے، اسی جگہ میدان جنگ میں نماز پڑھیں گے۔

اس موقع پر ایسی نماز پڑھی گئی جسے فقد میں ”نماز خوف“ کہا جاتا ہے۔ نماز خوف، مسافر کی نماز کی مانند چار رکعت کی بجائے دو رکعت ہوتی ہے۔ یعنی انسان اگر اپنے وطن میں بھی ہوتوا سے دور رکعت ہی پڑھنا چاہئے۔ کیونکہ حالات ساز گارنیس لہذا یہاں مختصر نماز پڑھنی چاہئے، اس لئے کہ تمام افراد کے نماز میں مشغول ہو جانے کی وجہ سے دفاع کی صورتحال خراب ہو جائے گی۔ سپاہیوں کا فرض ہے کہ اس نماز کے دوران آدھے سپاہی دشمن کا مقابلہ کریں اور آدھے امام جماعت کی اقتداء میں نماز پڑھیں۔ امام جماعت ایک رکعت پڑھنے کے بعد ڈھرتا ہے تاکہ مقتدی اپنی دوسری رکعت پڑھیں۔ اسکے بعد وہ جا کے اپنے دوسرے ساتھیوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ جبکہ امام اسی طرح بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرتا ہے۔ پھر دوسرے سپاہی آتے ہیں اور امام کی دوسری رکعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

امام حسین نے اسی طرح نماز خوف ادا کی۔ لیکن امام کو ایک خاص صورتحال در پیش تھی۔ کیونکہ آپ دشمن سے زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔ لہذا آپ کی حفاظت کرنے والا گروہ آپ کے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا، جبکہ بے حیا اور بے شرم دشمن نے انہیں نماز تک سکون

سے نہ پڑھنے دی۔ آپ نماز میں مشغول تھے کہ دشمن نے تیر اندازی شروع کر دی، آپ پر دو قسم کی تیر اندازی کی گئی، ان میں سے ایک زبان کی تیر اندازی تھی۔ دشمن کے ایک سپاہی نے چیخ کر کہا: حسین! نماز نہ پڑھو، تمہاری نماز کا کوئی فائدہ نہیں، تم اپنے زمانے کے امام (یزید) کے باغی ہو، لہذا تمہاری نماز قبول نہ ہوگی (نحوہ باللہ)۔ جبکہ دوسری تیر اندازی معمول کے مطابق کمانوں سے پھینکنے جانے والے تیروں کی تھی۔ امام حسین کے وہ ساتھی جنہوں نے اپنے آپ کو امام کی ڈھان بنا یا ہوا تھا ان میں سے ایک دو اصحاب (تیر لگنے کی وجہ سے) خاک پر ریڑے۔ ان میں سے ایک سعید بن عبد اللہ حنفی اس وقت گرے جب امام حسین اپنی نماز نماز کر رکھے تھے۔ وہ جانشی کے عالم میں تھے کہ امام ان کے سر برائے پہنچے۔ انہوں نے امام کو اپنے سر برائے دیکھ کر ایک عجیب جملہ کہا، عرض کیا: یا ابا عبد اللہ اوفیت (اے ابا عبد اللہ! کیا میں نے وفا کی؟)۔ یعنی، اب اس حال میں جسی اس سے دشمن میں یہ بات تھی کہ امام حسین کا حق اس قدر بلند و بالا ہے کہ اس کی اوائلیں لئے ایسی کرانقدر فدا کاری بھی شاید کافی نہ ہو۔

صحرائے کر بلا میں ابو عبد اللہ الحسین نے اس انداز سے نماز ادا کی۔

ابا عبد اللہ نے اس نماز میں تکبیر کی، ذکر کیا، سبحان اللہ کیا، بحول اللہ و قوته افون و اقعد کہا، رکوع و تجود کئے۔ اس نماز کے دو تین گھنٹے بعد امام حسین کے لئے ایک دوسری نماز پیش آئی، دوسرا رکوع پیش آیا، دوسرے سجود پیش آئے۔ ایک دوسرے انداز سے آپ نے ذکر کیا۔ آپ کا رکوع اس وقت ہوا جب ایک تیر آپ کے مقدس سینے میں اتر اور آپ اسے اپنی پشت کی طرف سے نکالنے پر مجبور ہوئے۔

کیا آپ کو پتا ہے کہ ابا عبد اللہ کے وجود کی کیا صورت تھی؟ آپ نے پیشانی پر سجد نہیں کئے، کیونکہ آپ بے بس ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرے تھے، لہذا آپ نے اپنا دا ہتھار حسار کر بلا کی گرم ریت پر رکھا۔

اس موقع پر ابا عبد اللہ کا ذکر تھا: بِسْمِ اللَّهِ وَبِاللَّهِ وَعَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ، وَلَا
حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ
الظَّاهِرِيْنَ ۔

بِسِمِكَ الْعَظِيمِ الْأَعْظَمِ ۔

خدا یا! ہماری عاقبت خیر فرماء، ہم سب کو اپنی عبادت، عبودیت اور بندگی کی توفیق
کرامت فرمائے۔

خدا یا! ہمیں حقیقی سماں گزاروں میں سے قرار ہے، ہم سب کی نیتوں کو خالص کر
دے۔ ہمیں شیاطین جن و انس کے شہر سے محفوظ فرمائے۔

خدا یا! ہم سب کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ رَحْمَةُ اللَّهِ مِنْ قَرَأَ الْفَاتِحَةَ مَعَ
الصلوات۔

